ہفت روزہ

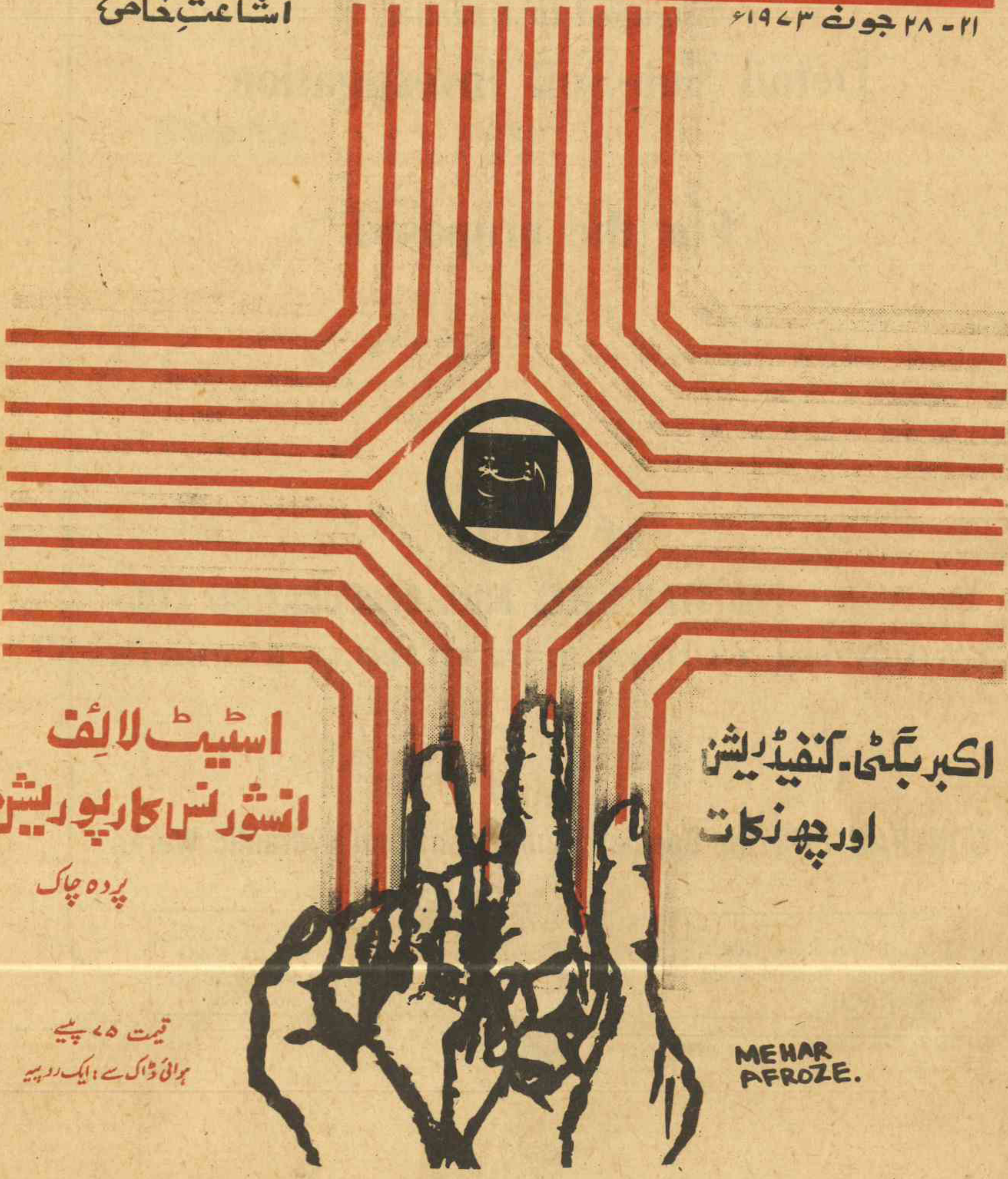
الفتح

کراچی

۲۱ - ۲۸ جون ۱۹۷۳ء

بینکاری

اشاعتِ خاص



اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن

پردہ چاک

اکبر بگٹی - کنفیڈریشن اور چھ نکات

قیمت ۷۵ پیسے

ہوائی ڈاک سے: ایک روپیہ

۲۱-۲۸ جون ۱۹۷۳ء
قیمت : ——— ۷۵ پیسے
ہوائی ڈاک سے : ایک روپیہ

مدیر
وہاب صدیقی

خدا کی بستی کے مظلوم
عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد : ۴ ——— شمارہ : ۶

اداریے

زہریلے ٹیکے

کسان بستی میں نمبردار، اس کے مشیروں اور کرتا دھرتاؤں کی پالیسیوں پر گھر گھر میں تبادلۂ خیال ہو رہا ہے، پنچایت کرنے کی اجازت نہیں، لہذا ہر کوئی اپنی اپنی ہانک رہا ہے. کوئی ایک بات کہتا ہے تو دوسرا اس سے مختلف تاویل پیش کرتا ہے، افواہیں تیزی سے پھیل رہی ہیں۔ ابھی حال میں ایک چوہدری نے یہ کہہ دیا تھا کہ ہماری بستی اور دوسرے اڑوس پڑوس کے قصبے اور شہر مل جائیں تو بہتر ہے، لوگ اس کو لے اُڑے ہیں کہ ہو نہ ہو، چوہدری تو پہلے ہی اس دشمن پڑوسی کے گن گاتا تھا جس نے دل سے ابھی تک ہماری بستی کے وجود کو تسلیم تک نہیں کیا۔ کئی بار چڑھائی بھی کر چکا ہے۔

یہ چوہدری کوئی معمولی شے نہیں۔ بستی کے لوگوں نے جسے اپنا چوہدری بنایا تھا، اسے ہٹا کر سیاہ و سفید کا مالک بن چکا ہے، دھڑلے کا آدمی ہے اسے نمبردار کی ہدایت پر پورے کیل کانٹے سے لیس کیا جا چکا ہے، نمبردار کا چہیتا بھی ہے، اب کون عقل کا اندھا ہو گا جو اتنے با اثر چوہدری کے منہ سے نکلی ہوئی بات پر یقین نہ لائے، یہ بات دوسری ہے کہ اس

خاص مضامین

●

سرورق : مہر افروز
عکاس : گرینگو
فون : ۴۱۲۲۷۴

ارشاد راؤ پبلشر نے حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد سے چھپوا کر دفتر ہفت روزہ الفتح، ۸ ڈی، نرسری کمرشل ایریا پی۔ ای سی۔ ایچ۔ ایس کراچی ۲۹ سے شائع کیا۔

کی بات بستی والوں کو پسند نہ آئے مگر پسند، نا پسند کی پرواہ کون کرتا ہے ایسا ہوتا تو موصوف چوہدری ہی کیوں بنتے۔

لوگ کہہ رہے ہیں کہ دال میں ضرور کالا ہے۔ بڑے گھر والے جب علیحدگی کی تیاریوں کو آخری شکل دے رہے تھے تو اس وقت بھی یہ سننے میں آیا تھا کہ "اِدھر ہم، اُدھر تم"۔ لوگوں نے کہا کہ لو معاملہ طے ہو گیا۔ بڑے گھر والوں کو کہہ دیا گیا ہے کہ وعلیکم السلام۔ اس پر یہ وضاحت کی گئی تھی کہ ادھر ہم اکثریت میں ہیں اور ادھر تم ہو۔ بھائی، بھائی سے جدا نہیں ہو سکتا۔

بستی والوں نے دیکھا کہ بھائی، بھائی سے جدا ہو گئے اس پر لوگوں نے "اِدھر ہم اُدھر تم" کا مطلب سمجھ لیا۔ اب چوہدری نے جو بات کہی ہے اس کے ایک مشیر نے اس کی تردید کر دی ہے مگر بستی والے مطمئن نہیں ہیں۔ ان کے ذہنوں میں شبہات پیدا ہو چکے ہیں اور آنکھوں کے سامنے عجیب وغریب نقشے گھوم رہے ہیں کان کنفیڈریشن۔ کنفیڈریشن کے الفاظ سے گونج رہے ہیں اور ہر کسی کو اپنا جسم ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا ہے، یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ایک بازو کے جدا ہونے کے بعد دوسرا اپنے آپ ریزہ ریزہ ہو رہا ہے، بظاہر یہ بازو جسم کا حصہ ہے مگر اعصابی مرض لاحق ہو چکا ہے۔

سنا ہے نمبردار، مرض کے علاج کے لئے سمندر پار کے اس ڈاکٹر سے رجوع کر رہا ہے جس کے ہر ٹیکے میں زہر بھرا ہوا ہے جس بستی کے لوگوں نے اس ڈاکٹر کی خدمات حاصل کی ہیں، اس میں مرنے والوں کی تعداد بڑھی ہے اور پھر بستی کے اندر ایسے ڈاکٹر پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے ڈاکٹر کو اپنی بستی سے نکال کر لوگوں کو ایک زندگی بخشی ہے، خوشحال اور توانا ماحول سے ہمکنار کیا ہے۔ کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ زہر کے ٹیکوں کا سودا ہو چکا ہے، ابتدائی کھیپ پہنچ چکی ہے" باقی مال نمبردار کی واپسی کے بعد آجائے گا اور پھر نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ ان زہر کے ٹیکوں کی قیمت بھی دینا پڑے گی، روپے، پیسے نہیں، بستی سمندر پار کے ڈاکٹر کے حوالے کرنا پڑے گی۔ زہر اور اس کی اتنی بڑی قیمت، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بستی والے سوچ رہے ہیں کہ ایسا ہی ہونا تھا تو بستی آباد کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ زہریلا ڈاکٹر بڑا مکار ہے۔ وہ مستقل ڈیرے ڈالنا چاہتا ہے۔ اس نمبردار سے بھی آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔ تھپکی اسے دیتا ہے۔ اور اصل میں اندر اندر نئے گھوڑے کو تیار کر رہا ہے۔ یہ گھوڑا ہوا سے باتیں کرتا رہا ہے۔ خوب مالش کی جا رہی ہے نمائش شروع ہو چکی ہے، رفتہ رفتہ اس قابل ہو جائے گا کہ کاٹھی کی جا سکے، ابھی لوگ بدک رہے ہیں۔ وہ بھی تول تول کر قدم رکھ رہا ہے۔ تاہم اس کی باتیں ہونے لگی ہیں۔

نمبردار کی نوکری چھوڑنے والے بعض ملشیئے اب اس کے تھان پر جمع ہو رہے ہیں، وہ اب اسے عوامی لبادہ پہنائیں گے اور وقت آنے پر میدان میں چھوڑ دیں گے۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ گھوڑا بھی پٹ جائے گا۔ زہریلے ڈاکٹر کے لئے اس بستی میں کوئی گنجائش نہیں۔

واقف حال

"تخریبی عناصر کو کچلنے کے لئے سنٹو سے امداد طلب کر لی گئی

سنٹو کو خدا حافظ کہنے والے اب اس کے گن گاتے ہیں

۱۱ جون کو تہران میں معاہدہ سنٹو کی وزارتی کونسل کا دو روزہ اجلاس ہوا۔ وزیرِ مملکت برائے دفاع و امورِ خارجہ مسٹر عزیز احمد نے پاکستان کی نمائندگی کی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں پاکستان کی سیاسی صورتِ حال پر روشنی ڈالی اور یہ انکشاف کیا کہ "پاکستان میں چند تخریبی عناصر کام کر رہے ہیں۔" انہوں نے اجلاس سے درخواست کی کہ تخریبی عناصر کی سرگرمیوں کی بیخ کنی کرنے کے لئے سنٹو کے رکن ممالک حکومتِ پاکستان کی مدد کریں۔ اخبارات کے مطابق پاکستانی وزیرِ خارجہ کی تقریر "بہت دل پذیر" تھی، اس سے مندوبین متاثر ہوئے۔ نتیجتاً معاہدہ سنٹو کا بنیادی مقصد کمیونسٹوں کی تخریبی سرگرمیوں کو کچلنا قرار پایا۔ اور بنگلہ دیش کے قیام میں دائی جنائی کے فرائض انجام دینے والے ملک برطانیہ کے نمائندے سر ڈگلس ہیوم نے بھی اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ انہوں نے ۱۲ جون کو تہران میں مقیم بی بی سی کے نمائندے کو جو انٹرویو دیا، اس کے اہم نکات یہ ہیں۔

■ اب معاہدہ سنٹو کا بنیادی مقصد کمیونسٹوں کی تخریبی سرگرمیوں کی بیخ کنی کرنا ہے۔ پہلے اس کا مقصد صرف فوجی کارروائیوں کی روک تھام کرنا تھا۔ لیکن اب فوجی کارروائیوں کے ساتھ ساتھ رکن ممالک میں ہونے والی تخریبی سرگرمیوں کا بھی مقابلہ کرنا ہے۔

■ کمیونسٹ ممالک صلح جوئی کے ساتھ ساتھ تخریبی سرگرمیاں بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔

■ پاکستان میں تخریبی عناصر سرگرم ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ کو بھی کمیونسٹوں کی ان سرگرمیوں پر تشویش ہے۔

■ پاکستانی تخریب پسند عناصر کی سرگرمیوں پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے، اور ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم جوابی کارروائی کرنے پر غور کریں۔

■ ناٹو، سیٹو اور سنٹو کے معاہدوں نے اپنے علاقوں کے بہت سے ملکوں پر روس کے اثرات کو غالب آنے سے روکا ہے

سنٹو کا پرانا نام معاہدہ بغداد ہے، پاکستان ۱۹۵۵ء میں اس معاہدہ میں شامل ہوا۔ اس وقت اس میں برطانیہ، ایران، ترکی، عراق اور پاکستان شامل تھے۔ امریکہ اس تنظیم میں خود شامل نہیں ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ شروع ہی سے اس کا گہرا تعلق رہا۔ دراصل یہ معاہدہ امریکہ کے ہی ایماء پر کیا گیا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں عراق نے اس معاہدے سے علیحدگی اختیار کر لی، تو اسے معاہدہ بغداد کی بجائے "سنٹو" کا نام دیا گیا۔ یہ معاہدہ بنیادی طور پر "کمیونسٹ جارحیت" کے خلاف ہے۔ پاکستانی عوام نے روزِ اوّل سے ہی اس معاہدہ کی مخالفت کی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ ایک سامراجی فوجی معاہدہ ہے، جس کا مقصد امریکی سامراج اور برطانوی نوآبادکاروں کے مفادات پورے کرنا ہے، پاکستان کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اُلٹا نقصان اُٹھانا پڑے گا۔ کمیونسٹ ممالک اور دنیائے عرب کے سوشلسٹ ممالک ناراض ہو جائیں گے۔ روس اور امریکہ کی سرد جنگ میں پاکستان شامل ہو جائے گا جو ملک کے لئے خطرناک ثابت ہوگی۔ اس کے علاوہ عوام بخوبی جانتے تھے کہ پاکستان کو کمیونسٹ ممالک سے خطرہ نہیں ہے، بلکہ بھارتی جارحیت کا خدشہ ہے۔ ان ہی وجوہات کی بناء پر محبِ وطن اور عوام دوست طاقتوں نے اس معاہدے کی مخالفت کی۔ اس وقت منبر اقتدار سے کہا گیا کہ سنٹو کی مخالفت کرنیوالے "ملک دشمن" اور "کمیونسٹوں کے ایجنٹ" ہیں۔ سنٹو پاکستان کی آزادی اور سلامتی کا ضامن ہے۔ پاکستانی حکمرانوں نے اسی معاہدے پر قناعت نہیں کی، بلکہ ۱۹۵۹ء کے اوائل میں امریکہ سے دو طرفہ فوجی تعاون کا معاہدہ کیا، جس کا مقصد سنٹو کے "دفاعی مقاصد" کو مزید تقویت دینا تھا۔ اس طرح بقول ایوب خان، پاکستان ایشیاء میں امریکہ کا "سب سے زیادہ متحد اتحادی" بن گیا۔

پاکستانی عوام کے خدشات درست نکلے۔ سنٹو میں شمولیت اختیار کرنے کی وجہ سے روس ناراض ہو گیا اور بھارت کی حمایت کرنے لگا۔ اس کا اعتراف امریکہ نواز ایوب نے بھی کیا چنانچہ وہ اپنی کتاب "فرینڈز ناٹ ماسٹر" میں لکھتا ہے۔

"اسی سال پاکستان میں امریکہ کے ساتھ اپنے اس اتحاد کے باعث اور بھی زیادہ دباؤ پڑا۔ ۱۹۵۵ء میں جب پاکستان معاہدہ بغداد (حالیہ سنٹو) میں شریک ہوا تو سووت

یونین کو یہ بات ناگوار گزری۔ اس وقت تک سوویت یونین کا روّیہ کشمیر کے جھگڑے کے سلسلے میں غیر جانبدار رہا تھا جب کبھی سلامتی کونسل میں یہ مسئلہ پیش ہوتا تو اس کے نمائندے ووٹ دینے سے احتراز کرتے، مگر اب سوویت یونین نے پاکستان پر الزام لگایا کہ وہ معاہدہ بغداد میں شامل ہو کر ایک "جارحانہ مغربی تنظیم" کا رکن بن گیا ہے۔ اور کشمیر کے بارے میں سوویت یونین کا رویہ یکسر بدل گیا۔ اب اس نے ہندوستان کی ہاں میں ہاں ملانی شروع کر دی کہ — کشمیر میں نہ تو کوئی رائے شماری ممکن ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ کشمیر ہندوستان کا "اٹوٹ انگ" ہے۔"

سنٹو میں شریک ہونے سے پاکستان اور دنیائے عرب کے ترقی پسند ممالک کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ کیونکہ عرب سمجھتے تھے کہ معاہدہ کا مقصد عربوں کے درمیان پھوٹ ڈالنا ہے۔ اور پاکستان مغربی سامراجی طاقتوں کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔ خصوصاً صدر ناصر نے اس کی سخت مخالفت کی، اور ان کے اندیشے بھی درست نکلے۔ ۱۹۵۹ء میں جب سویز کی جنگ ہوئی تو پاکستان کے حکمرانوں نے برطانیہ اور فرانس کا ساتھ دیا۔

اتنے دوستوں کو دشمن بنا لینے کے باوجود پاکستانی حکمرانوں کو عقل نہیں آئی۔ وہ بدستور سنٹو اور سیٹو کو ملک کی آزادی اور سالمیت کا ضامن قرار دیتے رہے۔ ستمبر ۶۵ء

بلا تبصرہ

سنٹو کمیونسٹوں کی تخریبی سرگرمیوں کی بیخ کنی کرے گا

لندن —— ۱۲ر جون۔ برطانیہ کے وزیر خارجہ سر ڈگلس ہیوم نے کہا ہے کہ سنٹو نے رکن ممالک میں کمیونسٹوں کی تخریبی سرگرمیوں کا سختی سے نوٹس لیا ہے۔ انہوں نے آج تہران میں بی بی سی کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ معاہدہ سنٹو کا بنیادی مقصد اب کمیونسٹوں کی تخریبی سرگرمیوں کی بیخ کنی کرنا ہے۔ کیونکہ کمیونسٹ ممالک صلح جوئی کے ساتھ ساتھ تخریبی سرگرمیاں بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان میں تخریبی عناصر سرگرم ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ کو بھی کمیونسٹوں کی ان سرگرمیوں پہ تشویش ہے۔ مسٹر ڈگلس ہیوم سے سوال کیا گیا کہ سنٹو کے وزراء کی کونسل کے حالیہ اجلاس کے نتیجہ میں کیا سنٹو نے اپنی بنیادی پالیسی میں کچھ تبدیلی کی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ سنٹو کی بنیادی پالیسی میں تو کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی گئی۔ تاہم کچھ امور میں ردّوبدل کیا گیا ہے۔ پہلے اس کا مقصد صرف فوجی کارروائیوں کی روک تھام کرنا تھا لیکن اب فوجی کارروائیوں کے ساتھ رکن ممالک میں ہونے والی تخریبی سرگرمیوں کا بھی مقابلہ کرنا ہوگا۔

بی بی سی کے نمائندے نے سوال کیا کہ کیا اب معاہدہ سنٹو فوجی اور تخریبی سرگرمیوں کو روکنے کا ادارہ بن گیا ہے؟ سر ڈگلس ہیوم نے جواب دیا کہ میں اس کو اس طرح کہوں گا کہ کمیونسٹوں کی جانب سے تخریبی سرگرمیاں سنٹو کے بہت سے رکن ممالک میں جاری ہیں۔ سنٹو نے ان سرگرمیوں کا نوٹس لیا ہے۔ ان سرگرمیوں کی وجہ سے نہ صرف سنٹو کو انتہائی چوکس اور مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا ہوگا۔ بلکہ ان سرگرمیوں پر قابو پانے کی بھی سخت ضرورت ہے، اور اب یہی سنٹو کا مقصد ہے۔ معاہدے کے رکن ممالک کی قومی حکومتیں ان سرگرمیوں کو کچلنے کے لیے جو کوششیں کر رہی ہیں۔ سنٹو ان کی ہر ممکن مدد کرے گا۔ برطانوی وزیر خارجہ سے سوال کیا گیا کہ کمیونسٹ ممالک اس وقت صلح جوئی کی جانب مائل نظر آرہے ہیں۔ تو کیا ان تخریبی کارروائیوں سے ان کے موقف میں تضاد ظاہر نہیں ہوتا —؟ سر ڈگلس ہیوم نے جواب دیا کہ کمیونسٹ ممالک اس وقت صلح جوئی اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ تخریبی کارروائیاں بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ یہ ایک بین الاقوامی حقیقت ہے۔ لیکن گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہم چوکنے ہیں اور مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ بہرحال یہ ایک حقیقت ہے اور ہمیں ہر صورت اس پر یقین کرنا ہی پڑے گا۔ ان سے پوچھا گیا کہ کیا امریکہ اور برطانیہ کو بھی کمیونسٹوں کی تخریبی سرگرمیوں سے خطرہ لاحق ہے جبکہ یہ سرگرمیاں سنٹو کے دیگر رکن ممالک میں ہی نظر آتی ہیں۔ تو برطانوی وزیر خارجہ نے جواب دیا کہ برطانیہ اور امریکہ کو بھی کمیونسٹوں کی تخریبی سرگرمیوں سے سخت تشویش ہے۔ انہوں نے کہا کہ اومان میں کمیونسٹوں کی جانب سے نہ صرف تخریبی سرگرمیوں کا خطرہ لاحق ہے بلکہ فوجی مداخلت کا بھی اندیشہ ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ سنٹو کے اجلاس میں پاکستانی نمائندے جناب عزیز احمد نے سنٹو کو بتایا کہ ان کے ملک میں چند تخریبی عناصر کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان سرگرمیوں پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے اور ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم جوابی کارروائی کرنے پر غور کریں۔ ان سے پوچھا گیا کہ سنٹو میں پاکستان کی واپسی اور گہری دلچسپی کی کیا وجہ ہے، جب کہ اندیشہ تھا کہ وہ سنٹو سے علیحدہ ہو جائے گا۔ سر ڈگلس ہیوم نے جواب دیا کہ پاکستان بڑے ہولناک تجربے سے گزرا ہے۔ اس تجربے کے نتیجہ میں پاکستان کے دو ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ سنٹو کے اجلاس میں پاکستان کے نمائندے نے جس جذبے کے ساتھ تقریر کی تھی، ہم اس جذبہ سے واقف ہیں۔ اور علاقائی ممالک بھی پاکستان کے جذبے کو یقیناً سمجھتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ماضی میں نظر ڈالیے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ناٹو، سیٹو اور سنٹو کے معاہدوں نے اپنے علاقوں کے بہت سے ملکوں پر روس کے اثرات کو غالب آنے سے روکا ہے۔

"تخریبی عناصر" کے بہانے عوام دوست طاقتوں کے خلاف سازش

میں بھارت نے پاکستان کے خلاف مسلح جارحیت کی تو حکومت پاکستان نے سنٹو اور سیٹو کو پکارا، اپنے مغربی اتحادیوں کو آواز دی، لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی، بلکہ انہوں پاکستان کی فوجی امداد بند کر دی۔ اس کٹھن مرحلے پر جن ممالک نے ساتھ دیا، تو وہ عوامی جمہوریہ چین اور سوکارنو کا انڈونیشیا تھا۔ اس موقعے پر پاکستانی عوام نے پھر مطالبہ کیا سامراجی فوجی معاہدوں سے نجات حاصل کی جائے۔ تو کہا گیا کہ یہ معاہدے کمیونسٹ جارحیت کے خلاف ہیں۔ ان میں شامل رہنے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ اگر کمیونسٹ جارحیت ہوئی تو یہ معاہدے ہمارے کام آئیں گے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ میں سوویت یونین نے اعلانیہ بھارت کو مادی اور فوجی امداد دی، اور کھل کر بھارت کا ساتھ دیا۔ دنیا جانتی تھی کہ جارحیت کا اصل مرتکب روس ہے، مگر اس وقت بھی ان معاہدوں نے ساتھ نہ دیا۔ حالانکہ ۱۹۷۱ء میں ناٹو کے حوالے سے بھی دہائی دی گئی۔ دو طرفہ پاک امریکی فوجی معاہدے کا واسطہ بھی دیا گیا۔ دہائی کا امریکہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ خاموشی سے تماشہ دیکھتا رہا اور پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا۔ سیٹو، سنٹو اور پاک امریکی دو طرفہ معاہدے دھرے رہ گئے۔

اگر بغور جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پاکستان نے ۶۵ء کے بعد سنٹو اور سیٹو میں دلچسپی لینی چھوڑ دی تھی۔ ان کی حیثیت محض کاغذی رہ گئی تھی۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی نے برسر اقتدار آتے ہی سنٹو میں گہری دلچسپی لینی شروع کر دی۔ سنٹو میں موجودہ حکومت کی گہری دلچسپی کے مدِ نظر اگر سیٹو سے علیحدگی اختیار کرنے کا تجزیہ کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ سیٹو سے علیحدہ ہونے کا مقصد سامراجی فوجی معاہدہ سے چھٹکارا حاصل کرنا نہیں تھا، بلکہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد پاکستان جنوب مشرقی ایشیا کا حصہ نہیں رہا تھا، اس لئے سیٹو سے علیحدگی اختیار کر لی گئی۔ ویسے بھی صدر بھٹو نے کہا تھا کہ سیٹو میں رہنے یا نہ رہنے کا فیصلہ کرنے کی ذمہ داری شیخ مجیب پر ہے۔

سنٹو میں حکومتِ پاکستان کی گہری دلچسپی اس امر کی عکاسی کرتی ہے کہ اس نے آزاد خارجہ پالیسی کا دعویٰ ترک کر دیا ہے۔ یہ اقدام پاکستان پیپلز پارٹی کے منشور کے منافی ہے۔ کیونکہ پیپلز پارٹی سامراج دشمن جماعت کی حیثیت سے منظرِ عام پر آئی تھی۔ پاکستان کے موجودہ صدر اور پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر ذوالفقار علی بھٹو بین الاقوامی برادری میں سامراج دشمن کی حیثیت سے ابھرے۔ پاکستان کے مزدوروں، کسانوں اور طالب علموں میں اسی وجہ سے مقبول ہوئے۔ ایوب خان کی کابینہ سے مستعفی ہونے کے بعد مسٹر بھٹو نے بھی سنٹو اور سیٹو کی اعلانیہ مخالفت کی، اور انہیں ملکی مفادات کے منافی قرار دیا۔ چنانچہ سنٹو کے بارے میں اپنی کتاب "پاکستان اور فوجی معاہدے" میں لکھتے ہیں ——

"وقت نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ یہ معاہدے پاکستان کے لئے اُس وقت بھی صفر اور نقصان دہ تھے، جب پاکستان کو فوجی امداد مل رہی تھی۔ کیونکہ جب پاکستان سنٹو کا رُکن بن گیا، تو جواہر لال نہرو نے کہا کہ پاکستان سرد جنگ کو برصغیر میں لے آیا ہے۔ وہ سنٹو کو اپنی سالمیت کا مخالف قرار دے کر کشمیر کے مسئلے پر اپنے ملک کے وعدوں سے منحرف ہو گئے۔ دوسری طرف سوویت یونین نے سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر پر ویٹو کر کے پاکستان کو سزا دی۔ سوویت یونین نے یہاں تک جانبداری اختیار کر لی کہ بھارت کے دورہ کے دوران وزیر اعظم خروشچیف نے سری نگر جانے کے ارادے کا اظہار کر دیا، جو کہ متنازعہ ریاست کا دار الحکومت ہے۔ اور یہاں سے انہوں نے دنیا پر ظاہر کیا کہ سوویت یونین جموں و کشمیر کو بھارت کا ایک الحاقی حصہ تسلیم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان کو سزا دینے کے لئے سوویت یونین نے افغانستان کے اس بے بنیاد اور باطل دعویٰ کو مزید تقویت دی کہ پاکستان کے کچھ حصے افغانستان کا حصہ ہیں۔ مغربی حلیفوں کے خلاف سوویت یونین کی مخالفت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے اس بڑی طاقت کے ساتھ تعلقات وسیع کئے اور اس سے انتہائی فائدہ اُٹھایا جو پاکستان کے لئے نقصان دہ تھا۔ اقوام متحدہ اور عالمی مسائل میں ان دونوں ممالک کے تعلقات اتنے گہرے ہو گئے کہ بھارت نے غیر جانبدارانہ ممالک پر مشتمل تعیری دنیا کی سربراہی حاصل کر لی۔ یہ تعاون صرف اہم ترین سیاسی مدّوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ معاشی اور فوجی مسائل تک محیط تھا۔ بھارت کو دی جانے والی روسی امداد میں ہر سال معتدبہ اضافہ ہوا۔ سوویت یونین نے پاکستان کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا"

"سنٹو نے نہ صرف پاکستان کے مفادات کو نقصان پہنچایا، بلکہ اگر چین اور بھارت کا تنازعہ پیدا نہ ہوتا تو اس سے بھی کہیں زیادہ خطرناک تباہی کا سبب پیدا ہوتا۔۔ میری رائے میں پاکستان کا حقیقی مفاد بہتر طور پر اس طرح پورا ہوتا ہے کہ بے کار معاہدوں سے چھٹکارا پا لیا جائے۔ ملک کو جانبدار اور خطرناک فوجی ذمہ داریوں سے آزاد کیا جائے اور جب ایک بار یہ ہو گیا تو پاکستان کی سلامتی اور خود مختاری یقینی ہو جائے گی۔"

اس کے علاوہ مسٹر بھٹو نے اپنی کتاب "میتھ آف انڈیپنڈنس" "پاکستان اور معاہدے" میں سنٹو اور سیٹو جیسے سامراجی معاہدوں پر نشتر زنی کرتے ہوئے انہیں پاکستان اور پاکستانی عوام کی آزادی اور خود مختاری کے لئے زہر ہلاہل قرار پایا۔ پاکستان

پاکستان کو ایک بار پھر سامراج کا غلام بنا دیا گیا

ایک طرف دوستی کا دعویٰ۔ دوسری طرف دشمنی کی باتیں

پیپلز پارٹی کے منشور میں ان سامراجی معاہدوں سے علیحدگی اختیار کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ پیپلز پارٹی کی قیادت نے الیکشن کی مہم کے دوران خصوصیت اس مسئلے پر اظہارِ خیال کیا، اور عام انتخابات میں اس کی کامیابی اسی وجہ سے ہوئی لیکن برسرِ اقتدار آنے کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی کی مرکزی حکومت نے سنٹو اور دو طرفہ پاک امریکی فوجی معاہدے جیسے مردہ گھوڑے میں دوبارہ روح پھونکنے کا اعلان کیا۔

• ۔ ۲۴ر جنوری ۷۲ء کو صدر بھٹو نے کہا کہ "ہم سنٹو کو از سرِ نو موثر بنانا چاہتے ہیں۔"

• ۔ ۱۳ر فروری ۷۲ء کو امریکہ سے دفاعی معاہدے کی پیش کش کی گئی۔

• ۔ ۲۹ر مئی ۷۲ء مرکزی وزیر تعلیم مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ نے بیان دیا کہ "موجودہ حالات میں پاکستان کی سنٹو سے وابستگی ضروری ہے۔"

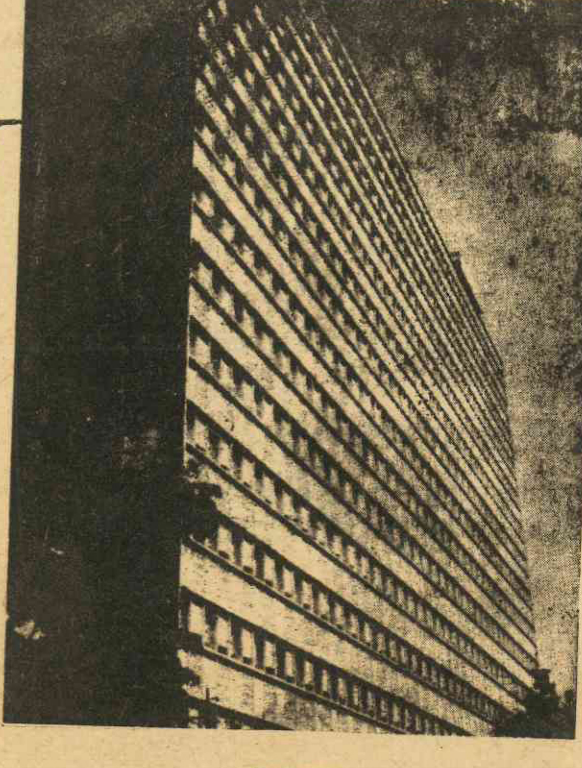
• ۔ نومبر ۱۹۷۲ء میں بحیرۂ ہند کے مغربی علاقے میں پاکستان نے ستمبر ۶۵ء کی جنگ کے بعد پہلی مرتبہ سنٹو کی بحری مشقوں میں حصہ لیا۔ بی بی سی کے مطابق پاکستان نے ایران کے کہنے پر ان مشقوں میں شرکت کی تھی۔

حالات کا رُخ بتا رہا تھا کہ حکومتِ پاکستان، ملک کو امریکہ کی گود میں ڈال رہی ہے۔ مسٹر عزیز احمد کے حالیہ بیان اور سنٹو کے حالیہ فیصلوں کے بعد یہ بات بہت واضح ہو گئی ہے کہ برسرِ اقتدار طبقہ نے ماضی سے کوئی سبق نہیں سیکھا اور ۱۹۵۵ء کی خارجہ پالیسی پر عمل کر رہی ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ابھی غیر جانبدارانہ پالیسی کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ حال ہی میں حیدر آباد میں صدرِ پاکستان نے فرمایا کہ سوویت یونین کو ناراض کرنے کا نتیجہ ہم نے دیکھ لیا۔ اب ہم اس سے تعلقات بڑھا رہے ہیں۔ روس سے ہمارے تعلقات اچھے ہیں۔ وہ ہمارا دوست ہے، لیکن قول و فعل میں زمین و آسمان کا تضاد ہے۔ ایک طرف روس سے دوستی کا دعویٰ کیا جا رہا ہے، دوسری جانب اسے دشمن سمجھا جا رہا ہے۔

پاکستان کے عوام موجودہ حکومت کی متضاد باتوں سے اس حد تک آگاہ ہو چکے ہیں کہ وہ حکومت کے خولہ[illegible] اور بھڑک دار پروپیگنڈے سے قطعاً متاثر نہیں۔ المیہ[illegible] حکومت کی لاف زنی سے نہیں بلکہ اس کے رویہ سے پیدا ہوتا ہے کہ اس نے خارجہ پالیسی کی خطرناک الجھنوں اور حقائق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ جس پر عمل کر کے وہ پاکستان جیسے چھوٹے ملک کو "پاور پالٹکس" میں جھونک رہی ہے۔ سنٹو میں گہری دلچسپی کا ایک ہی نتیجہ برآمد ہوگا، کہ پاکستان میں امریکی سامراج کا اثر بڑھ جائیگا۔ برصغیر میں سردجنگ مزید تیز ہو گی۔ سوویت یونین اور دیگر کمیونسٹ ممالک سے تعلقات خراب ہو جائیں گے۔ اور پاکستان، ایشیا اور افریقہ کے چھوٹے ملکوں سے کٹ جائیگا۔ حالانکہ پاکستان کا مستقبل ایشیا اور افریقہ سے وابستہ ہے۔

پاکستانی وزیرِ خارجہ نے سنٹو کے اجلاس میں "پاکستان میں

(باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ فرمائیں)



پردہ چاک

اسٹیٹ لائف
انشورنس کارپوریشن آف پاکستان

خصوصی خدمت
کا صلہ
بورڈ آف ڈائریکٹرز کی ڈکٹیٹ

الفتح رپورٹ

پیپلز پارٹی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ملکی اور قومی مفاد کے نام پر متعدد صنعتوں کو حکومت نے اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ ان میں سے صرف بیمہ حیات کی صنعت ایسی صنعت ہے جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اسے مکمل طور پر قومی ملکیت میں لے لیا گیا ہے۔ تقریباً چالیس ملکی اور غیر ملکی بیمہ کمپنیوں کو ملا کر ایک کارپوریشن قائم کر دی گئی۔ مسٹر ایچ۔ یو بیگ ـــــ کو اس کارپوریشن کا چیئرمین بنا دیا گیا۔ چیئرمین صاحب کی ایمانداری، نیک نیتی اور اخلاق کی خوب تشہیر کی گئی۔ ان کی مدد کے لئے ایک مجلسِ نظماء بھی قائم کی گئی۔ جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا کہ اس میں ماہرین شامل ہیں۔

اس طرح عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ صنعت کے نئے منتظمین کے ہاتھوں میں ان کا بیمہ محفوظ رہے گا۔ قومی سطح پر اس صنعت سے خاطر خواہ فوائد حاصل ہوں گے۔ لیکن گزشتہ ایک سال کا جائزہ لیا جائے تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن سے عوام نے جو توقعات وابستہ کر رکھی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں۔

اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن دعویٰ کرتی ہے کہ ۱۹۷۲ء کے دوران میں ہونے والا کاروبار ۷۱ء کی نسبت زیادہ تھا۔ اس طرح قومی تحویل میں آنے کے بعد بیمہ حیات کے کاروبار میں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ کارپوریشن کے دعوے کے مطابق کل بیمہ شدہ رقم کی حد میں ۷۱ء کی نسبت ۱۹۷۲ء میں ۲۲،۴۴ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ پہلے سال کے پریمیم میں زیر تبصرہ سال کے دوران ۲،۲۰ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ پریمیم کی کل آمدنی میں ۷،۹ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ کارپوریشن کے جاری کردہ اعداد و شمار میں زیادہ زور گروپ انشورنس پر دیا گیا ہے۔ جس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ ایک سال کے دوران گروپ انشورنس کے پہلے سال کے پریمیم کی آمدنی میں ۲۲،۹ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ ۷۱ء کے دوران اس مد میں کل ۵ لاکھ ۸۸ ہزار روپے وصول ہوئے تھے جب کہ ۱۹۷۲ء میں ایک کروڑ ۴۰ لاکھ روپے وصول ہوئے۔ بظاہر یہ اعداد و شمار خاصے تسلی بخش معلوم ہوتے ہیں۔ اور کارپوریشن کی نئی انتظامیہ کی کارکردگی کے متعلق خوشگوار تاثر مرتب کرتے ہیں۔ لیکن ذرا سا غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارے اعداد و شمار حسابی گورکھ دھندے کے سوا کچھ نہیں۔ تفصیلات میں گئے بغیر ہم یہاں صرف یہ عرض کریں گے کہ کارپوریشن کے اربابِ اختیار نے ۱۹۷۱ء کے کاروبار سے موازنہ کیا ہے۔ حالانکہ ۷۱ء کے متعلق ہر شخص یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ مذکورہ سال سیاسی ابتری اور بے چینی کا سال تھا۔ پچھلی فوجی آمریت نے پوری قوم کو مایوسی کے غار میں دھکیل دیا تھا۔ مشرقی پاکستان میں ہنگامے ہو رہے تھے۔ ہماری تجارت، صنعت اور معیشت بُری طرح مجروح تھی۔

ایک صوبائی وزیر نے خوش ہو کر انہیں اعلیٰ منصب بخش دیا

مذکورہ سال ہر اعتبار سے پسماندگی اور بحران کا سال تھا۔ اس زمانے میں بیمے کا کاروبار بھی عام سیاسی حالات سے متاثر ہوا۔ اس کے برعکس ۱۹۷۲ء نئی اُمنگوں اور نئے ولولوں کا سال تھا۔ صدر بھٹو اسی سال برسرِ اقتدار آئے تھے، اور یہ امید بندھ چلی تھی کہ بچا کھچا پاکستان اب بحران سے نکل جائیگا۔ ۱۹۷۱ء کاروباری تعطل کا سال تھا تو ۷۲ء نئے سرے سے آغاز کا سال تھا۔ اگر اس دوران ۷۱ء کے مقابلے میں بیمے کا کاروبار کچھ بڑھا بھی تو اس کا سہرا اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن کی انتظامیہ کے سر نہیں باندھا جاسکتا۔ بہرحال اس حسابی گورکھ دھندے کا پردہ کسی حد تک اس وقت چاک ہوا، جب کارپوریشن نے ۷۳ء کے عبوری بونس کا اعلان کیا۔ اپنے پچھلے دعووں کی پردہ پوشی کے لئے کارپوریشن کے اربابِ اختیار نے اس بات کا تو اعتراف کیا ہی نہیں کہ بونس کی شرح پچھلے سالی کی نسبت کم ہے، ساتھ ہی پچھلے سال کے بونس کے اعداد و شمار بھی جاری نہیں کئے تاکہ کوئی شخص نئی شرح کا پرانی شرح سے موازنہ ہی نہ کرسکے۔ تاہم کچھ اخبار نویسوں نے کارپوریشن کے ایک ڈائریکٹر مسٹر والاجاہی کے سامنے یہ نکتہ اٹھایا کہ ماضی کے مقابلے میں کارپوریشن نے بونس کی شرح کم کردی ہے اور یہ بات کارپوریشن کے پچھلے دعووں کے برعکس ہے تو تعلقاتِ عامہ اور تربیت کے ذمہ دار ڈائریکٹر صاحب نے فرمایا کہ بونس کارپوریشن کی کارکردگی کی عکاسی کرتا ہے۔ ڈائریکٹر صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ "ہم بونس کی شرح میں مصنوعی طور پر اضافہ کیسے کرسکتے ہیں"۔ موصوف کے اس ایک ہی جملے سے اس بات کی نشاندہی ہوجاتی ہے کہ بیمہ زندگی کے قومی ملکیت میں آنے کے بعد بیمے کے کاروبار میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔

کارپوریشن کی کارکردگی کی یہ ایک ہلکی سی جھلک تھی لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کارپوریشن کی کارکردگی میں یہ خامی کیوں ہے؟ کارپوریشن کے قیام کو کئی ماہ ہوچکے ہیں لیکن مختلف شعبوں میں ابھی تک غیر یقینی صورتِ حال کیوں ہے؟ تمام امور صحیح طرح انجام کیوں نہیں پاتے؟

یہ بات تو اب بخوبی واضح ہوچکی ہے کہ قومی ملکیت میں لینے کا نعرہ محض سیاسی وجوہ کی بنیاد پر لگایا تھا۔ پیپلز پارٹی جب برسرِ اقتدار آئی تو اس نے بھی انہی وجوہ کے تحت بیمے کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ پارٹی میں زیادہ اثر ان لوگوں کا تھا، جو جاگیردار اور زمیندار طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ انہیں بیمے جیسی صنعت کا نہ تو کوئی تجربہ تھا اور نہ ہی وہ اسے منظم کرنے کے سلسلے میں کسی واضح نظریے کے حامل تھے۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ ابتداء میں اسے قومیانے کی تمام تر ذمہ داری سابق کنٹرولر آف انشورنس مسٹر خلفے کے کندھوں پر آپڑی۔ انہوں نے اپنی مصلحتوں کی بناء پر لائف انشورنس منجمنٹ بورڈ میں ایسے افراد کو نامزد کیا جو ان کے ایک مخصوص حلقے سے متعلق تھے یا پھر ایک ممتاز سرمایہ دار کے حامی تھے۔ اس کے بعد جب لائف انشورنس کارپوریشن قائم ہوئی اور مسٹر ایچ۔ یو بیگ کو اس بات کا موقع

ڈائریکٹروں کے

واجب الادا قرض

لاکھوں روپے

معاف کر دیئے گئے!

ملا کہ وہ بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ارکین کے متعلق سفارش کریں تو انہوں نے بھی مسلمانوں کی ایک قدیم ترین بیمہ کمپنی کے تین اعلیٰ عہدیداروں کو بورڈ آف ڈائریکٹرز کا رکن بنانا پسند کیا۔ اس میں تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس کمپنی کے ایڈوانسز کی حد ایک کروڑ روپے سے زیادہ تھی۔ یہی بات بذاتِ خود اس بات کے لئے کافی تھی کہ اس کمپنی کے اعلیٰ افسروں کو اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن سے دور رکھا جائے، کیونکہ ایک کروڑ روپے سے زیادہ کے قرضے جاری کرنے کے سلسلے میں ان افسران کی ذمہ داری کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ اپنی کمپنی کی ملازمت کے دوران ان میں سے بیشتر پر بڑے بڑے قرضے بھی موجود تھے۔ لیکن یہ بات آج تک معلوم نہیں ہو سکی کہ ان قرضوں کا کیا ہوا؟ کچھ افواہیں یہ ہیں کہ ڈائریکٹر بنانے سے قبل یہ قرضے معاف کردیئے گئے۔ بہرحال مسلمانوں کی اس قدیم ترین بیمہ کمپنی سے تعلق رکھنے والے تین ڈائریکٹرز میں سے ایک ڈائریکٹر بھی ہیں اور اسٹیٹ لائف کے ایک یونٹ کے جنرل مینجر بھی ہیں۔

اسٹیٹ لائف کے باقی پانچ ڈائریکٹروں میں سے دو کا تعلق آئیڈیل لائف انشورنس کمپنی سے رہا ہے۔ انکے متعلق حیرت ناک بات یہ ہے کہ مذکورہ کمپنی کے سابق جنرل مینجر مسٹر سیکورا کارپوریشن میں دو تنہا فرد ہیں جن کا کسی گروپ سے ابھی تک کوئی تعلق سامنے نہیں آیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں صرف محض ان کی دیانت اور تجربے کی بناء پر بورڈ آف ڈائریکٹرز میں نامزد کیا گیا ہے، یا پھر محض عیسائی اقلیت کو نمائندگی دینے کے سلسلے میں وہ بورڈ کے رکن نظر آرہے ہیں۔ آئیڈیل لائف سے تعلق رکھنے والے دوسرے صاحب کے متعلق بیمے کی صنعت میں یہ بات زبان زدِ عام ہے کہ انہیں ایک صوبائی گورنر کی "خصوصی خدمت" کے نتیجے میں یہ منصب ملا ہے، ورنہ وہ محض ایک چھوٹے سے شہر میں زونل مینجر تھے۔ اپنے تجربے اور علم کے اعتبار سے اس قابل نہیں تھے کہ انہیں کارپوریشن کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل کیا جاتا۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ بورڈ میں نامزدگی کے سلسلے میں خود کارپوریشن کے چیئرمین مسٹر ایچ۔ یو بیگ اور مرکزی وزیر تجارت مسٹر جے۔ اے۔ رحیم بھی مخالف تھے، لیکن ان کی مخالفت بے کار ثابت ہوئی۔ باقی تین ڈائریکٹرز مسٹر طور، مسٹر قریشی اور مسٹر سمیع الحسن کارپوریشن کے چیئرمین مسٹر بیگ کی نظرِ کرم سے ڈائریکٹر نامزد ہوئے۔ اس طرح کارپوریشن شروع ہی سے سفارشوں اور خویش نوازیوں کا اڈہ بن گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر مرحلے پر سفارش اور اقرباپروری کا بازار گرم ہوگیا۔ یہاں تک کہ کوئی شخص بھی سفارش اور اقربا داری کے بغیر کسی کنٹین کا ٹھیکہ بھی حاصل نہیں کرسکتا۔ ان سفارشوں

(باقی صفحہ ۱۲ پر ملاحظہ فرمائیں)

اس کے تین سالہ بچے کو قتل کر دیا گیا؟

میرا گھر تباہ کرنے والو مجھے بھی مار ڈالو

-• الفتح رپورٹ •-



—— گل رحمان

قانون کے محافظ ظلم کی پشت پناہی کر رہے ہیں

موجودہ حکومت نے اعلان کیا تھا کہ ملک میں قانون کی عملداری ہوگی۔ قانون کی نظروں میں ہر شخص برابر ہوگا۔ انصاف کے دروازے سب پر کھلے ہوں گے۔ معاشرے کے ہر فرد کو بلا امتیاز قانون کا تحفظ حاصل ہوگا۔ ظلم کرنے والا خواہ کسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو، کتنا با اثر ہو، وہ اپنی سماجی پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر قانون سے نہیں بچ سکے گا۔"

اس اعلان پر کس حد تک عمل کیا گیا۔ ایک عام آدمی کو موجودہ دور میں انصاف کے حصول میں کہاں تک سہولتیں حاصل ہیں، اس کا اندازہ آپ اس واقعہ سے لگا سکتے ہیں۔

سندھ الکلینز لمیٹڈ کے ورکمین سرور خان کی بیوی اور اس کے بچے کو اغوا کر لیا گیا۔ اس نے پولیس میں رپورٹ درج کرانے کی کوشش کی تو اسے دھتکار دیا گیا۔ یہ پولیس کی ذمہ داری تھی کہ اس کی رپورٹ پر اس کی بیوی بچے کو برآمد کیا جاتا۔ ظالم کا ہاتھ پکڑا جاتا۔ مظلوم کی دادرسی کی جاتی۔ قانون اور انصاف کا بول بالا کیا جاتا۔ لیکن الٹا عمل کیا گیا۔ ظالم کے ہاتھ کو ظلم جاری رکھنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ مظلوم کی دادرسی کرنے کی بجائے اسے ٹھوکر مار کر بھگا دیا گیا۔ اور انصاف کا گلا گھونٹ کر اس کی آواز دبا دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اغوا کے واقعہ سے ایک ماہ بعد بقول سرور خان اس کے تین سالہ بچے کو مبینہ طور پر قتل کر دیا گیا۔ اس دلدوز واقعہ کے باوجود پولیس اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی اور اس کی ناک کے نیچے ظلم کا کا دور دورہ ہے۔ قانون کے محافظ جب ظلم کی طرف سے اپنی آنکھ بند کر لیں تو کمزوروں اور مظلوموں کا کیا بنے گا۔؟

اس واقعہ کی تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں۔

سندھ الکلینز کا ورکمین سرور خان مظفر آباد کالونی میں رہتا ہے۔ ایک مختصر سے خاندان کا مالک ہے جس میں اسکی بیوی اور تین سال کا ایک بچہ گل رحمان شامل ہے۔ وہ جو کماتا اپنی بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ محنت اور مشقت کے سہارے اس کی گھریلو زندگی پرسکون اور طوفان سے نا آشنا تھی۔ اچانک سیاہ آندھی اٹھی اور اس کی گھریلو زندگی طوفان میں پھنسی کشتی کی طرح ہچکولے کھانے لگی۔ ہلاکت خیز طوفانی لہروں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا اور وہ بے سہارا اپنی زندگی اور اپنا گھر بار بچانے



سرور خان

کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ لیکن بے سود، اس کی ساری جدوجہد رائیگاں گئی۔ اس کا گھر ٹوٹ پھوٹ گیا۔ تنکے تنکے ہو کر فضا میں بکھر گیا۔

۲ اپریل ۱۹۷۳ء کو جب وہ گھر آیا تو اس کی بیوی اور تین سالہ بچہ غائب تھے۔ اس نے پاگلوں کی طرح آوازیں دیں، مگر جواب نہ ملا۔ اس نے ہر جگہ ڈھونڈا لیکن کوئی سراغ نہ ملا۔ مایوسی کے عالم میں اس نے انڈسٹریل ایریا لانڈھی پولیس سٹیشن میں اطلاع دی، لیکن ایف آئی آر بک میں اسکی شکایت درج کی گئی نہ ہی اس کی بیوی اور بچے کا پتا چلایا گیا۔ وہ حیران تھا کہ پولیس قانون کی محافظ ہے، مظلوموں کی دادرسی کے لیے بنائی گئی ہے، لیکن پولیس نے اس کی حمایت سے کیوں ہاتھ کھینچ لیا۔؟

پولیس کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد اس نے ذاتی طور پر بیوی بچے کی تلاش کی مہم جاری رکھی۔ وہ محلے محلے، گلی گلی اور شہر شہر گھومتا رہا۔ آخر اس کی بھاگ دوڑ رنگ لائی۔ اسے پتا چلا کہ گھارو میں بخش ٹیکسٹائل کے ایک جابر (عہدہ کا نام) محمد قاسم نے مبینہ طور پر اس کی بیوی بچے کو زبردستی روک رکھا ہے۔ اس نے قانون کو ہاتھ میں نہیں لیا، بلکہ قانون کا احترام کرنے والے ایک شہری کی طرح اس نے اس واقعہ کی اطلاع لانڈھی پولیس اسٹیشن کو دی اور قانون کے محافظوں سے اپیل کی کہ وہ خدا کے نام پر اس کی بیوی اور بچے کو واپس دلائیں۔ لیکن پولیس نے اس کی اس دردبھری اپیل کو بھی حقارت سے نظرانداز کر دیا۔

لانڈھی پولیس کے اس سنگدلانہ رویے سے مایوس ہو کر اس نے ۱۹ اپریل ۷۳ء کو آئی۔جی۔پولیس کے نام ایک درخواست روانہ کی اور ان سے اپیل کی کہ اس معاملہ کو نمٹانے کے لئے لانڈھی پولیس مجھ سے تعاون کرے۔ میں اس شہر کا باشندہ ہوں، میرے سماجی حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ اگر انتظامیہ

اس کی بیوی کو اغوا کرلیا گیا

نے میری امداد سے ہاتھ کھینچ لیا تو مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑیگی۔"

سرورخان بہت عرصہ تک پولیس کی جانب سے کارروائی کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن اس کی درخواست پر جب کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا تو وہ شدید مایوسی کا شکار ہوگیا۔ اس کے باوجود اس نے ایک بار پھر لانڈھی پولیس اسٹیشن سے رابطہ قائم کیا اور اطلاع دی کہ اس کے بچے کی جان خطرے میں ہے۔ لیکن پولیس نے اس بات پر بھی کوئی توجہ نہ دی، بلکہ سرورخان کو پولیس اسٹیشن سے باہر نکال دیا گیا۔

سرورخان نے گورنر سندھ بیگم رعنا لیاقت علی خان کے نام اپنی درخواست میں گھارو ٹیکسٹائل کے جابر قاسم پر الزام لگایا کہ اس نے مبینہ طور پر اس کے تین سالہ بچے گل رحمان کو قتل کردیا۔ اس نے اپنی تحریری درخواست میں لکھا ہے کہ۔

"۳۰ مئی ۱۹۷۳ کو مجھے معلوم ہوا کہ کجنبش ٹیکسٹائل ملز کے جابر قاسم ولد شیر افضل نے اس کے بچے کو ہلاک کردیا۔ اس کے دوسرے دن یعنی ۳۱ مئی ۷۳ء کو میں نے ڈی۔ ایس۔ پی ملیر لانڈھی سب ڈویژن میں اپنے بچے کے قتل کی رپورٹ درج کرادی۔ ڈی۔ ایس پی نے میرے کیس کو لانڈھی انڈسٹریل ایریا پولیس اسٹیشن میں بھیج دیا جس کا نمبر آر، آر/ڈی ایس پی/نمبر ۲۷۵۷، آئی آر/ڈی ایس پی/نمبر ۵۸۰۔ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۷۳ء ہے۔"

لانڈھی پولیس اسٹیشن کے حکام نے اس سلسلے میں کوئی موثر قدم نہیں اُٹھایا۔ اور اس سے کہا گیا کہ دوسرے دن آؤ۔ جب وہ دوسرے دن پولیس اسٹیشن گیا تو دوبارہ اسے حکم دیا گیا کہ دوسرے دن آؤ۔ اس طرح ہر روز اس کے ساتھ ٹال مٹول کا رویہ اختیار کیا گیا۔

سرورخان نے اپنی درخواست میں اعلیٰ حکام سے قانون کے نام پر درد مندانہ اپیل کی ہے کہ چونکہ قاسم ایک بااثر آدمی ہے، اس لئے اسے انصاف سے محروم رکھا جارہا ہے۔ اس نے انسانیت کے نام پر اپیل کی ہے کہ اس کے بچے کے قتل کی تحقیقات کی جائے، اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم کیا جائے۔ اور اس کے بعد تدفین کے لئے اس کے بچے کی لاش کو اس کے حوالے کیا جائے۔ اس کی بیوی زیور جہاں کو قاسم کے چنگل سے رہا کرایا جائے۔ قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو عبرتناک سزا دی جائے۔

یہ اس ملک کے ایک باشندے کی کہانی ہے، جو مظلوم طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ موجودہ حکومت نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مظلوم طبقات کا تحفظ کرے گی اور انصاف کا دروازہ ان پر کھلا رکھے گی۔ لیکن حالات اور واقعات نشاندہی کرتے ہیں کہ حکومت اپنے فرائض ادا کرنے میں شدید غفلت کا شکار ہے۔ انتظامیہ پہلے کی طرح شیر بن چکی ہے اور وہ مظلوموں کی فریاد سننے کی بجائے کھل کر ظالموں کا ساتھ دے رہی ہے۔ یہ کہاں کا دستور ہے کہ انتظامیہ اور پولیس ظلم کا ساتھ دے رہی ہے۔ اور مظلوم کی گردن ناپ رہی ہے۔ رہزنوں اور قزاقوں کے ہاتھوں عوام کی عزت محفوظ نہیں رہی، گھروں کے دروازے زبردستی کھول کر عزت پر حملہ کردیا جاتا ہے۔ بھرے پڑے گھر کی خوشیاں چھین کر اسے ویران کردیا جاتا ہے۔ اور انتظامیہ خاموش تماشائی کی طرح سب کچھ دیکھتی رہتی ہے۔ اگر سرورخان کا بیان درست ہے تو اس سے زیادہ تکلیف دہ اور حوصلہ شکن بات اور کیا ہوگی کہ ایک شہری کی عزت پر ڈاکہ ڈالا جائے اور پھر اسے انصاف سے بھی محروم کردیا جائے۔

بقیہ پردہ چاک

کے نتیجے میں آگے بڑھنے والے افراد نے جو پالیسیاں اختیار کیں ان کے نتیجے میں کارپوریشن بنتے ہی فیلڈ ورکرز کی طویل ہڑتال ہوئی۔ پھر اس ہڑتال کو ختم کرنے کے لئے وہی طریقے اختیار کئے گئے جو عام طور پر اجارہ دار اور سرمایہ دار اختیار کرتے ہیں۔ کارپوریشن کا غیر ملکی بزنس بالکل تباہ ہوگیا۔ ٹریننگ کے سلسلے میں وظیفے کی جو اسکیم نافذ کی گئی، اس پر چار پانچ ہزار روپے خرچ کردیئے گئے لیکن اس کا اثر صفر رہا۔

یہاں ہر شخص کارپوریشن کے چیئرمین مسٹر بیگ سے یہ ضرور معلوم کرنا چاہے گا کہ انہوں نے کارپوریشن کو قومی ملکیت میں لینے کے بعد مختلف کمپنیوں کی کارکردگی کے متعلق ایک جائزہ رپورٹ تیار کرائی تھی۔ یہ رپورٹ وزیر تجارت جناب جے۔ اے۔ رحیم نے قومی اسمبلی میں پڑھی تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس رپورٹ سے کیا فائدہ اٹھایا گیا۔ اس رپورٹ میں جن لوگوں پر الزامات عائد کئے گئے تھے ان کے خلاف بعد میں کیا کارروائی ہوئی۔ بورڈ کا ڈائریکٹر نامزد کرتے وقت اس رپورٹ کا لحاظ کیوں نہیں رکھا گیا؟

جامعۂ کراچی کے کتب خانہ میں بدعنوانیاں

• الفتح رپورٹ •

آج کی مہذب دنیا میں مزدوروں کی یونین بھی کسی قاعدے اور قانون کے تحت چلائی جاتی ہے۔ اسی کی روشنی میں لائحہ عمل متعین کیا جاتا ہے۔ جس سے وہ یونین ایک لڑی میں پروئی ہوئی ہوتی ہے۔ ہر شخص کو اپنے حقوق اپنے فرائض اور غلطیوں کے خمیازے کا پورا علم ہوتا ہے۔ لیکن کراچی یونیورسٹی کے قانون کا مجموعہ جسے یونیورسٹی کوڈ کہا جاتا ہے، پہلے تو ہے ہی ادھورا۔ جو کچھ مصلحتاً اس میں لکھا گیا ہے وہ صرف ایک دکھاوا ہے۔ اس پر عمل اگر ہوتا بھی ہے تو یوں سمجھیے کہ قانون سر کے بل ٹانگیں آسمان کی طرف کئے کھڑا ہو جاتا ہے۔ جسے انگریزی زبان میں پیراڈاکس (PARADOX) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں یونیورسٹی کی کارروائیوں کا ایک معمولی سا نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔

یونیورسٹی کوڈ افسروں سے شرماتا ہے

یونیورسٹی کوڈ کچھ ایسے آرڈی ننسوں اور دفعات پر مشتمل ہے کہ اگر ذرا بھی اس کا خیال رکھا جائے تو باوجود اپنی بکثرت خامیوں کے یونیورسٹی کے معاملات کو ایک معقول اور درمیانہ ماحول برقرار رکھنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ کوڈ ان لوگوں پر فوری گرفت کرتا ہے جن کی اوپر شنوائی نہ ہو، اور یونیورسٹی کے ماتحت عملے سے شناخت نہ ہو۔ چند مثالیں درج ذیل کی جاتی ہیں —— جن کے لئے بظاہر یونیورسٹی کے ارباب اختیار کے پاس کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ "یہ وائس چانسلر کی اپنی مرضی ہے"۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یونیورسٹی کا وائس چانسلر ایک نہایت ہی بلند پایہ تعلیمی شخصیت ہوتی ہے، اور ہر قسم کے اعتراضات سے بلند تر ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کے معاملات میں ہر ہر نقطے کو پڑھنے، سوچنے اور سمجھنے کے لئے وائس چانسلر کے پاس اتنا وقت کہاں، انہیں تو ماتحت عملے کی رپورٹ پر ہی اعتماد کرنا پڑتا ہے یہ الگ بات ہے کہ ماتحت عملہ وائس چانسلر کے اعتماد کو جائز استعمال کرے یا ناجائز۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ متعین اصولوں کو یونیورسٹی کوڈ کا نام دے کر کیسے من مانی کرنے کے لئے "وائس چانسلر کی اپنی مرضی" کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔

(۱) ۔ کتب خانے کے ایک اسسٹنٹ لائبریرین حال ہی میں دو سال کی توسیعی مدت گزار کر قائم مقام ڈپٹی لائبریرین کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ یونیورسٹی کوڈ کے مطابق کسی یونیورسٹی ملازم کو توسیعی معیاد میں نہ ترقی مل سکتی ہے اور نہ ہی اس کی تنخواہ میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ لیکن یہاں یونیورسٹی کے حکام نے انہیں دو سال قائم مقام ڈپٹی لائبریرین کی حیثیت سے ترقی دی اور بالمقطع ان کی اصل تنخواہ سے تقریباً سو روپے زائد بھی دیئے۔ یہ رقم صاحب موصوف اپنی پوری توسیعی معیاد

یونیورسٹی کوڈ میٹھے پھل کی طرح افسروں کے دامن میں گرتا ھے

میں وصول کرتے رہے۔ حالانکہ یونیورسٹی کوڈ کے مطابق ان کو ترقی دینا اور زائد تنخواہ دینا، دونوں باتیں سراسر خلاف قانون تھیں۔ جونہی صاحب موصوف کی توسیعی معیاد پوری ہوئی تو کوڈ کا لحاظ رکھتے ہوئے معمولی سا آڈٹ اعتراض اٹھالیا، اور ایک ہفتہ کے اندر زائد لی ہوئی رقم کو اسپیشل الاؤنس کا نام دیکر قلم زن کر دیا گیا۔ لیکن ڈپٹی لائبریرین کے عہدے کو برقرار رکھا گیا۔ اس ہیرا پھیری میں یونیورسٹی کو تقریباً دو ہزار روپے کا تیل دیا گیا۔ داد دیجیے یونیورسٹی کے اس قانون دان طبقے کو جو قانون جانتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ قانون کے موڑنے توڑنے میں بھی صف اوّل کا ماہر ہے۔ جہاں کہیں اس فن میں ان کی منطق نہ چل سکی تو فوراً آخری سہارا "یہ وائس چانسلر کی مرضی ہے"۔ بول کر لے لیتے ہیں۔

(۲) ۔ یونیورسٹی کوڈ ببانگ دہل کہتا ہے کہ یونیورسٹی کے کسی ملازم کو رخصت برائے تعلیم تین سال ملازمت سے قبل نہیں دی جا سکتی۔ لیکن جب کہ اس سے پہلے شمار سے میں عرض کیا گیا ہے کہ ڈیڑھ پونے دو دو سال کے ملازمین کو بڑی تمکنت کے ساتھ اپنی تعلیمی قابلیت بڑھانے کے لئے رخصت مطالعہ دی گئی اور وہ بھی اوسط تنخواہ پہ۔ یونیورسٹی کوڈ دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ یونیورسٹی حکام نے اور نہ ہی ماتحت انتظامیہ عملہ کے کسی اتھارٹی نے رول ریگولیشن کی لاج رکھی۔

یونیورسٹی کے افسر اپنے ماتحت عملے کے نوٹ پر کام کرتے ہیں

تن آسانی اور فرائض سے غفلت کی انتہا ہے کہ اگر کسی یونیورسٹی کے افسر سے کسی معاملے میں فریاد کی جائے تو وہ صرف اتنا کہہ کر اپنا فرض ادا کر دیتے ہیں کہ "میاں! یہاں تو نوٹ پر کام چلتا ہے۔ کسی کو اتنی فرصت کہاں کہ ہر ہر بات کو پڑھ کر کوئی کارروائی کی جائے"۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل واقعہ قابل غور ہے۔

۱ ۔ لائبریری کے ایک ملازم کو بیماری کی چھٹی پر وائس چانسلر سے تنبیہہ دلائی گئی کیونکہ اس نے بیماری سے پہلے چھٹی کی درخواست

اسسٹنٹ لائبریرین کو ہزاروں روپے کا فائدہ پہنچا

کیوں نہیں دی تھی۔ حالانکہ اس چھٹی کی درخواست کے ساتھ بیماری اور صحت یابی کے دونوں سرٹیفیکیٹ منسلک تھے۔ اتنا ضرور ہوا کہ جزوقتی لائبریرین نے وقت کی تنگی کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے درخواست پڑھے بغیر ہی اپنی ناراضگی کا اظہار اس درخواست پر ان الفاظ میں کر دیا تھا کہ "چھٹی کے لئے پہلے درخواست کیوں نہیں دی گئی"۔ حالانکہ درخواست دہندہ نے قائم مقام ڈپٹی لائبریرین کو اپنی بیماری سے مطلع کر دیا تھا اور قائم مقام ڈپٹی لائبریرین نے جزوقتی لائبریرین کو بتا بھی دیا تھا۔ چنانچہ جزوقتی لائبریرین کے ریمارک پر تو انتظامیہ کے متعلقہ رکن نے فوراً عمل کر دیا اور بیماری کے مذکورہ سرٹیفیکیٹس کا ذرا بھی خیال نہ کیا۔ اور تنبیہاً لکھ دیا کہ وائس چانسلر نے فرمایا ہے کہ آئندہ چھٹی گزار کر درخواست نہ دی جائے۔ مقام تعجب ہے کہ ایک بیمار ملازم اپنی بیماری کی معیاد کیسے متعین کر سکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ اپنی بیماری کے متعلق اطلاع دے سکے۔

۹۔ ایک چودہ سالہ پرانے یونیورسٹی کے ملازم کی ترقی کے لئے یونیورسٹی کی انتظامیہ نے کوئی چھ مہینے اس لئے صرف کئے کہ وہ آدمی کاغذات میں تو موجود تھا لیکن یونیورسٹی کے ارباب اقتدار اسے جانتے تھے اور نہ ہی متعلقہ کارندے اس سے واقف تھے۔ اگر واقف تھے بھی تو اس سے کچھ اجنبیت کی بو آتی تھی۔ جن صاحب کی جگہ اسے ترقی دینی تھی وہ بڑے مزے سے تین فرائض بیک وقت انجام دیتے رہے۔

(i) اسسٹنٹ لائبریرین کی ذمہ داری۔

(ii) عارضی طور پر ڈپٹی لائبریرین کے فرائض بمعہ الاؤنس۔

(iii) لائبریری سائنس ڈیپارٹمنٹ میں جزوقتی لیکچرار بمعہ الاؤنس۔

تعجب تو یہ ہے کہ ان تین فرائض کو انجام دینے والے صاحب صبح کے وقت اسٹاف بس میں آتے تھے اور شام کو ٹھیک تین بجے اسی اسٹاف بس میں یونیورسٹی کیمپس سے نکل جاتے تھے۔ یونیورسٹی کو ڈ انگشت بدنداں تماشا دیکھتا رہا لیکن چونکہ افسروں کے ہاتھ کا معاملہ تھا، لہذا کسی قسم کی کوفت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جزوقتی لائبریرین صاحب کی نیک تمنائیں بھی ان کی شامل حال تھیں۔

لائبریری میں قسمت آزماؤں کا گروہ

جزوقتی لائبریرین کی کم فرصتی کی وجہ سے لائبریری کے معاملات اکثر حقیقت کو چھوڑ کر نمائشی رنگ اختیار کر چکے ہیں۔ اس قسم کی بدنظمی میں قدرتی امر ہے کہ ابن الوقت اور موقع شناس لوگ فوائد حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ لائبریری میں قسمت آزماؤں کی ایک اچھی خاصی منڈی کی تشکیل ہو چکی ہے۔ جس کے افراد ایک طرف تو یونین کے سرگرم رکن ہیں اور دوسری طرف جزوقتی لائبریرین کو مبالغہ آمیز اور غلط سلط باتیں سنا سنا کر مرعوب کر کے اپنا کام سیدھا کئے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک فرد نے ایک ہی وقت میں ۲۵ روپے ماہوار الاؤنس مستقلاً منظور کرایا ہوا ہے۔ جو کہ ابتداً انہیں بحیثیت سرحریر کے تین چار سال پہلے دیا گیا تھا۔ کیونکہ وہ صاحب روزانہ دو گھنٹے زائد کام کرتے تھے۔ بعد میں کام تو ختم ہو گیا لیکن الاؤنس جاری رہا۔ وہی صاحب اب ترقی کر کے سینئر کلرک بن چکے ہیں۔ فالتو وقت کا مسئلہ بالکل ختم ہے لیکن اب وہ الاؤنس کارکردگی کی بجائے ایک شخصی پنشن بن چکا ہے۔

انہی صاحب نے گزشتہ سالہا سال سے یونیورسٹی میں رہائشی کوارٹر حاصل کر رکھا ہے، اور خود شہر میں قیام پذیر ہیں۔ ان کے کوارٹر میں جو صاحب رہتے ہیں ان کے متعلق یونیورسٹی حکام نے کبھی یہ دریافت کرنے کی تکلیف گوارہ نہیں کی کہ وہ کون ہیں اور کس سمجھوتے پر یونیورسٹی کے مکان کو استعمال کر رہے ہیں۔ لائبریری میں نیو کراچی، لانڈھی اور کورنگی میں رہنے والے تو رات آٹھ دس بجے تک فرائض انجام دیتے ہیں لیکن یہ صاحب مقررہ وقت کے بعد کبھی بھی لائبریری میں نظر نہیں آتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جزوقتی لائبریرین کی نظروں میں وہ بہت ہی اونچا مقام رکھتے ہیں اور لائبریری کے معاملات میں کچھ من گھڑت اور خود ساختہ افسانے سناتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کے مقتدر طبقہ کے ساتھ ان کے اچھے مراسم ہیں۔ اس قسم کے معاملات میں یونیورسٹی کوڈ بالکل بے بس ہے۔

انتظامیہ اپنی مرضی سے بھی لوگوں کو ڈپلومے اور ڈگریاں دے سکتی ہے

یہ کسے معلوم نہیں ہے کہ یونیورسٹی کی ڈگری یا ڈپلومے کو بغیر پاس کئے ہوئے نام کے ساتھ لکھنا جرم ہے۔ اگر کوئی اس طرح کی حرکت کر بھی لیتا ہے تو یونیورسٹی کے مواخذہ سے ہر وقت خوفزدہ رہتا ہے کہ کہیں کوئی پوچھ نہ لے کہ یہ ڈگری آپ نے کہاں سے اور کیسے حاصل کی۔ لیکن یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ یونیورسٹی کے عملہ سے اچھے تعلقات کی بنا پر یونیورسٹی کے ملازم خود ہی اس آدمی کے نام کے ساتھ فرضی ڈگری یا ڈپلومہ لکھ دیتے ہیں۔ تھوڑا ہی عرصہ گزرا ہے کہ لائبریری کے ایک ملازم کو بیک وقت دو مدارج اوپر ترقی دینے کے لئے یونیورسٹی کے درجہ سوم کی سنیارٹی لسٹ میں رجسٹرار آفس نے ڈپلومہ پاس کے اعزاز سے نوازا۔ حالانکہ اس ڈپلومے کے نتیجے کا تقریباً دو ماہ بعد اعلان کیا گیا۔ چنانچہ اسی غلطی کا سہارا لے کر ان صاحب سے سینئر ملازمین کی کھلی حق تلفی کی گئی۔ باوجود شور و فغاں کے بڑا افسوس ہے کہ اس نقار خانے میں کسی نے غریب طوطی کی زبان پر ذرا دھیان نہ دیا۔ اور اس جعلی پاکھنڈ کی بدولت ایک ڈھورے سے اسکالر کے سر پر ترقی کی دستار فضیلت بندھوا کر ہی یونیورسٹی کی انتظامیہ نے دم لیا۔ اور وہ صاحب چوکڑیاں بھرتے ہوئے اس مرتبہ پر جا براجمان ہوئے جہاں پہنچنے کے لئے کئی سال درکار ہیں۔ جزوقتی لائبریرین اس کھلی دھاندلی کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے بظاہر تو پر تولتے رہے لیکن درپردہ ان کی بھی نیک خواہشات اس کار خیر میں شامل تھیں۔ لہذا اس گرجتے ہوئے بادل سے ایک بوند بھی نہ ٹپکی۔ اور وقت نے جو بہترین معالج ہے، مظلوموں کے زخموں پر صبر کی پٹی باندھ دی۔

متعدد ملازم اپنے نام کے ساتھ فرضی ڈگریاں استعمال کرتے ہیں

کورے لٹھے کی شکل تبدیل کر کے

برآمد کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا گیا

الفتح رپورٹ

ہمارے ملک میں ٹیکسوں کا جو موجودہ نظام چلا آرہا ہے، اس کے ذریعہ ٹیکسوں کی چوری پر کوئی موثر قدغن نہیں لگایا جا سکتا۔ اپنے یہاں کے صنعت کار اور تاجر برادری بڑی چالاک اور تیز طرار ہے۔ وہ اپنے فن میں اتنی مہارت رکھتی ہے کہ ہر پابندی اور قانون کا جال توڑ کر اپنی بچت کی راہ نکال لیتی ہے۔ بیوروکریسی چونکہ ہمرکاب ہوتی ہے، اس لئے ٹیکسوں کی چوری کا مسئلہ آسانی سے طے ہو جاتا ہے۔

نئے وفاقی بجٹ میں مارکین یا کورا لٹھا پر ۲۵ فیصد برآمدی ٹیکس اس نیت سے لگایا گیا ہے کہ ہمارے ملک میں عام استعمال کا کپڑا کم قیمت پر آسانی سے دستیاب ہو سکے۔ ادھر کچھ عرصہ سے کورا لٹھا بھی عوام کی قوت خرید سے باہر ہو گیا تھا۔ تاجر اور صنعتکار زیادہ منافع کمانے کی ہوس میں عوام کے استعمال کا معمولی کپڑا بھی دھڑا دھڑ برآمد کر رہے تھے۔ اسی طرح وہ سوت اور روئی بھی برآمد کر کے گھر بیٹھے بے پناہ نفع کما رہے تھے۔ چنانچہ ملک میں سوت اور روئی کی زبردست قلت کے سبب ہزاروں کھڈیاں بے کار ہو گئیں اور لاکھوں کاریگر فاقہ کشی کی حالت میں پہنچ گئے ہیں۔ کھڈی کے کاریگروں نے بار بار حکومت سے اپیل کی کہ بڑے بڑے صنعت کار سارا سوت خرید کر بیرون ملک برآمد کر دیتے ہیں، اس طرح کھڈی والوں کو سوت نہیں ملتا۔ ہزاروں کھڈیاں بے کار ہو گئیں۔ اور لاکھوں کاریگر بیروزگار ہو چکے ہیں۔ اس لئے سوت کی برآمد پر مکمل پابندی عائد کی جائے۔ لیکن حکومت نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صنعت کاروں نے اپنے ملک میں کپڑے کی پیداوار بہت کم کر دی اور وہ کوئی خطرہ مول لئے بغیر سوت برآمد کر کے لاکھوں روپے کماتے رہے۔ مقامی مارکٹوں میں کپڑے کی قلت پیدا ہوئی تو تاجروں نے قیمتوں میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ عام استعمال کا کورا لٹھا بھی عوام کی قوت خرید سے باہر ہو گیا۔

اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے حکومت نے وفاقی بجٹ میں مارکین یا کورا لٹھا پر ۲۵ فیصد برآمدی ٹیکس عائد کر دیا۔ سوت اور روئی پر بھی برآمدی ڈیوٹی لگا دی گئی تاکہ خام مال، مارکین یا کورا لٹھا کی برآمدات کو کنٹرول کیا جا سکے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ تاجر برادری انتہائی چالاک ہے۔ اس لئے وہ اس میں بھی اپنی بچت کی راہ نکال لے گی۔

آسان طریقہ یہ ہے کہ چونکہ سفید شرٹنگ لٹھا اور کچے رنگ کے کپڑے پر کوئی ٹیکس نہیں ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر مارکین کو سفید شرٹنگ اور لٹھا میں تبدیل کر لیا جائے گا۔ یا کچی رنگائی کر دی جائے گی۔ کورا لٹھا کو سفید لٹھا اور شرٹنگ میں تبدیل کرنے پر صرف ۱۸۰ پیسے فی گز اور کچے رنگ کا کپڑا بنانے پر صرف دو پیسے فی گز صرف ہوں گے۔ اس طرح سفید لٹھا اور شرٹنگ برآمد کرنے پر کوئی برآمدی ڈیوٹی ادا نہیں کرنی پڑے گی جس سے ۲۵ پیسے فی گز اور کچے رنگ کے کپڑے

کھڈی کی صنعت تباہی کے

کنارے پر پہنچ گئی

پر ۲۳ پیسے فی گز بچت ہوگی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کورا لٹھا کو سفید شرٹنگ لٹھا اور کچے رنگ کے کپڑے میں تبدیل کر کے برآمد کر دیا جائے گا۔ اور ملک میں کپڑا سستا نہ ہوگا۔ تاجر اور بڑے بڑے صنعت کار پہلے کی طرح عوام کو عام استعمال کے کپڑے سے محروم رکھ کر منافع کمائیں گے۔ اور حکومت تاجروں کی شاطرانہ چال سے مات کھا کر منہ دیکھتی رہ جائیگی۔

ادھر کھڈی کی صنعت خام مال کی قلت کے سبب سنگین بحران کا شکار رہے گی۔ کیونکہ بجٹ میں اس صنعت کو فروغ دینے کی جانب کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ سوت اور روئی کی برآمدی ڈیوٹی میں برائے نام اضافہ سے بڑے بڑے منافع خور تاجروں اور صنعت کاروں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ وہ ماضی کی طرح چھوٹی صنعتوں کو تباہ کرنے کی پالیسی پر گامزن رہیں گے۔ وہ حکومت کے اعلانات اور پابندیوں کی کبھی پرواہ نہیں کرتے۔ اپنی مرضی سے کام کرتے ہیں اور ان کی خواہش کے مطابق اشیاء کی قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دور ایوبی میں سوت کی کنٹرول قیمت ۱۷ روپے ۵۰ پیسے فی بنڈل مقرر کی گئی تھی۔ لیکن جس وقت موجودہ حکومت نے اقتدار سنبھالا تو اس کی قیمت ۲۶ روپے فی بنڈل تھی۔ اب بنڈل کی قیمت ۷۰ روپے ہو گئی ہے۔ بڑے صنعت کار مقامی مارکٹوں سے سوت کے بنڈل تھوک کے حساب سے خرید لیتے تھے اور بیرون ملک درآمد کر کے لاکھوں روپے پیدا کرتے تھے۔ مقامی مارکٹوں میں سوت کی قلت کے سبب چور بازاری شروع ہوگئی اور اس کی قیمت دیکھتے دیکھتے کھڈی کے عام کاریگروں کی پہنچ سے باہر ہوگئی۔ سوت کے جو بنڈل باہر جانے سے بچ جاتے انہیں بلیک کر دیا جاتا۔ اس طرح ملک میں ہزاروں کھڈیاں سوت کی قلت کے سبب بند ہو گئیں۔

اس صورت سے صرف ایک طریقہ سے نمٹا جا سکتا ہے۔

الف — سفید شرٹنگ لٹھا اور کچے رنگ کے کپڑے پر بھی دس پیسے فی گز برآمدی ڈیوٹی لگائی جائے۔ تاکہ کورا لٹھا کو سفید شرٹنگ یا کچے رنگ میں تبدیل کرنے کا عمل بے کار ثابت ہو جائے۔ برآمدی ڈیوٹی کی چوری روکی جا سکے۔ اور عوام کو سستا کپڑا مل سکے۔

ب — ملک میں کپڑا سستا کرنے، کھڈی کی صنعت کو مکمل تباہی سے بچانے کے لئے روئی اور سوت کی برآمدات پر مکمل پابندی عائد کی جائے۔ یا کم از کم ان پر سو فیصد برآمدی ڈیوٹی لگائی جائے۔ تاکہ اس کے ذریعہ صنعت کار گھر بیٹھے لاکھوں روپے کا منافع نہ کما سکیں۔

کنفیڈریشن

پاکستان کا وجود ختم کردے گی

الفتح رپورٹ

"ٹائیگر آف بلوچستان" نواب اکبر بگٹی نے اپنے مذموم منصوبوں پر پردہ ڈالنے کی سرتوڑ کوشش کی۔ منصوبوں کو خفیہ رکھنے کے لئے مرکزی حکومت کے آغوش میں جا بیٹھے۔ اپنے

خفیہ سوسائٹی

شیر محمد مری کے خلاف مقدمہ میں پاکستان سوشلسٹ سوسائٹی برطانیہ کا ذکر کچھ اس طرح کیا گیا کہ یہ ایک خفیہ سوسائٹی ہے۔ اور وہ شیر محمد سے کسی قسم کی سازش میں شریک تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ شیر محمد مری نے سوشلسٹ سوسائٹی کی جس میٹنگ سے خطاب کیا اس میں بلوچستان کے موجودہ گورنر نواب محمد اکبر بگٹی بھی موجود تھے۔ حاضرین نے دونوں رہنماؤں سے براہ راست سوال کئے۔ اور سوسائٹی کی اس میٹنگ کا مقصد پاکستان اور خصوصاً بلوچستان کے بارے میں ان بلوچ رہنماؤں کے نظریات سے روشناس ہونا تھا۔

میٹنگ صرف اور صرف اس لحاظ سے "خفیہ" تھی کہ جب ایک بن بلائے مہمان مسٹر نسیم احمد (سابق نمائندہ ڈان اور موجودہ انفارمیشن سیکرٹری) وہاں آ وارد ہوئے تو انہیں متفقہ فیصلے کے بعد میٹنگ سے نکال دیا گیا تھا۔ میٹنگ میں شریک ہونے والے لوگ ان کے سابقہ کردار کی روشنی میں اپنی میٹنگ میں ان کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

(پاکستان سوشلسٹ سوسائٹی کا ترجمان ماہنامہ جدوجہد۔ شمارہ مئی جون ۱۹۷۳ء)

سیاسی مخالفین کے خلاف بیانات دیکر "محافظِ بلوچستان" کا خطاب پایا۔ نیپ پر "غداری" کا الزام لگا کر اپنی "پاک دامنی" کا ثبوت مہیا کیا۔ لیکن براہوان کی نوابانہ اور سردارانہ ذہنیت و تربیت کا، کہ منصوبوں کو خفیہ رکھنے سے ان کا پیٹ پھولنے لگا۔ اگر وہ نواب اور سردار کم اور سیاست دان زیادہ ہوتے تو عوامی اصلاحات کا سہارا لیتے۔ عوام کے غم میں دُبلے ہوتے، اور در پردہ اپنے منصوبوں پر کام کرتے رہتے، لیکن وہ "پیٹ کا درد" برداشت نہ کر سکے۔ چنانچہ ۶ جون کو انہوں نے اخبار نویسوں کے سامنے اپنے خفیہ منصوبوں اور مذموم خواہشات کو اُگل دیا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق نواب اکبر بگٹی نے پاکستان کے مختلف شہروں سے آئے ہوئے صحافیوں کی ایک جماعت سے گفتگو کرتے ہوئے پاکستان، بھارت، افغانستان، ایران، بنگلہ دیش، برما، سری لنکا اور نیپال کے درمیان ایک ڈھیلی ڈھالی کنفیڈریشن کی تجویز پیش کی، جو مساویانہ بنیادوں پر ایک دوسرے کی آزادی، خود مختاری کے احترام پر مبنی ہو۔

نواب اکبر بگٹی کے اس بیان پر شدید ردِ عمل ہوا۔ حزبِ اختلاف نے اس بیان کو زیرِ بحث لانے کے لئے ۸ جون کو قومی اسمبلی میں تحریکِ التوا پیش کی۔ اس تحریک کے جواب میں مرکزی وزیرِ قانون و پارلیمانی امور مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ نے حقائق معلوم کرنے کے لئے وقت مانگا۔ حیرت کی بات ہے کہ دو دن گزر جانے کے باوجود مرکزی حکومت حقائق سے لاعلم تھی۔ حالانکہ اکبر بگٹی کے اس بیان کا ملک کی خارجہ پالیسی سے براہ راست تعلق تھا۔ جسے مرکزی حکومت کنٹرول کرتی ہے۔ مرکزی حکومت کا فرض تھا کہ وہ فوری طور پر حقائق معلوم کرتی اور اکبر بگٹی سے جواب طلب کر کے ضروری اقدامات کرتی، لیکن نجانے کن وجوہات کی بناء پر مجرمانہ غفلت سے کام لیا گیا۔

اگرچہ ۹ جون کو گورنر بلوچستان اکبر بگٹی کے معاونِ خصوصی صوبیدار معینوی نے ایک پریس کانفرنس میں اس بات کی تردید کردی کہ گورنر بگٹی نے پاکستان، بھارت، افغانستان، ایران، برما



اکبر بگٹی

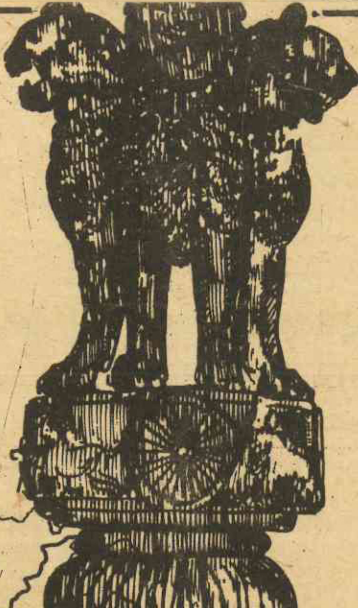
کنفیڈریشن

سری لنکا، بنگلہ دیش اور نیپال پر مشتمل ایک ڈھیلی ڈھا[...]
بنانے کی تجویز پیش کی تھی۔ لیکن ابھی تک اکبر بگٹی نے ا[...]
نہیں کی ہے۔ ان کی پُر اسرار خاموشی اس بات کی دلیل [...]
کنفیڈریشن بنانے کی تجویز پر آج بھی قائم ہیں۔

در حقیقت نواب اکبر بگٹی نے ہمیشہ دوہرا کر[...]
ہے۔ نیپ کے رکن نہ ہونے کے باوجود ۱۹۷۰ء کے [...]
میں انہوں نے نیپ کا ساتھ دیا۔ الیکشن کے زمانے [...]
جا کر نیپ کے لئے ووٹ مانگے۔ عام انتخابات میں [...]
بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی، تو اکبر بگٹی نے [...]
چولا بدلا۔ اور شیخ مجیب کے چھ نکات کے زبردست [...]
گئے۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کے اواخر میں موصوف نے فلیٹیز ہوٹل [...]
ایک پریس کانفرنس میں چھ نکات کی زبردست حما[...]
کہ چھ نکات کا نفاذ صرف مشرقی پاکستان میں ہی نہ[...]
پاکستان کے چاروں صوبوں پر ہونا چاہیئے۔ اس پر [...]
میں یہ بھی کہا کہ چھ نکات تو کوئی چیز نہیں، ہم اس [...]
خود مختاری کے حامی ہیں۔

جنوبی ایشیا

اشوک چکر کے حوالے کرنے کی سازش







6 نکات

مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک کا اکبر بگٹی بغور جائزہ لیتے رہے اور منصوبے بناتے رہے۔ حسنِ اتفاق سے صدر بھٹو روس کے دورے پر اپنے ساتھ اکبر بگٹی کو بھی لے گئے۔ صدر بھٹو کا دورہ ختم ہونے کے بعد، اکبر بگٹی پاکستان واپس آنے کی بجائے روس میں ہی ٹھہر گئے۔ اور وہاں مختلف روسی رہنماؤں اور محکموں کے سربراہوں سے مذاکرات کے بعد لندن پہنچے۔ جہاں انہوں نے ایک طویل عرصے تک قیام کیا۔

لندن میں قیام کے دوران اکبر بگٹی نے بنگلہ دیش کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے برطانوی پارلیمان کے ارکان سے جن میں جان اسٹون ہاؤس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ طویل مذاکرات کئے۔ متعدد ملاقاتیں کیں۔ اکبر بگٹی نے لندن میں قیام کے دوران ہفت روزہ "اخبارِ وطن" لندن کے نمائندے پرویز بشیر کو انٹرویو دیتے ہوئے اپنے مذموم منصوبوں کا اظہار کیا، جن کا تعلق بلوچستان میں ایک علیحدہ مملکت قائم کرنا اور اس مقصد کے لیے ہتھیار اٹھانے سے تھا۔ اکبر بگٹی نے بتایا کہ ایک بڑی طاقت کی انہیں حمایت حاصل ہے۔ اور اس طاقت نے اسلحہ فراہم کرنے کی بھی یقین دہانی کرائی ہے۔ اپنے انٹرویو میں اکبر بگٹی نے یہ بھی کہا کہ اگر ہم نے بھارت کی سرپرستی قبول کر کے اس کی طفیلی ریاست بننا منظور نہ کیا تو پاکستان کا رہا سہا وجود بھی ختم ہو جائے گا۔

اس انٹرویو کی اشاعت پاکستانی حلقوں کے لئے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ کچھ ہی دنوں بعد روزنامہ نوائے وقت لاہور کے نمائندہ خصوصی بشیر ریاض نے لندن میں ہی اکبر بگٹی سے ملاقات کی اور اس انٹرویو میں بھی اکبر بگٹی نے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ حکومتِ پاکستان نے اس انٹرویو کا فوراً نوٹس لیا۔ سرکاری ذرائع ابلاغ عامہ، ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے اکبر بگٹی کے خلاف پروپیگنڈہ کیا گیا۔ وزارتِ اطلاعات نے انہیں "غدار" "لندن پلان کا خالق" یا "عظیم تر بلوچستان کا حامی" "غیر ملکی ایجنٹ"



گورنر بلوچستان "ایشیائی تحفظ کے نظام" پر عمل کرنا چاہتے ہیں!

اور "مجیب کا دستِ راست" جیسے القاب سے نوازا۔

ادھر وطنِ عزیز میں سیاست نے نیا رخ اختیار کیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی میں ٹھن گئی۔ مرکزی حکومت اور بلوچستان کی صوبائی حکومت کے درمیان اختلافات کی خلیج وسیع تر ہو گئی۔ اس موقع پر مرکزی حکومت نے اکبر بگٹی کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھایا۔ اکبر بگٹی نیپ سے پہلے ہی ناراض تھے۔ کیونکہ نیپ نے انہیں اقتدار میں شامل کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اقتدار ملنے کے بعد وہ اپنے وعدہ سے منحرف ہو گئی۔ اور بگٹی قبیلہ میں پھوٹ ڈالنے اور اکبر بگٹی کا زور توڑنے کے لئے احمد نواز بگٹی کو صوبائی کابینہ میں شامل کر لیا۔ جب مرکزی حکومت نے اکبر بگٹی سے رابطہ قائم کیا تو وہ فوراً تیار ہو گئے۔ اور سرکاری گواہ بن کر اپنے تمام گناہ دھو ڈالے۔ اور اس کے صلہ میں گورنری کا عہدہ پایا۔

نواب اکبر بگٹی نے کنفیڈریشن کی جو تجویز پیش کی ہے۔ وہ ماسکو کے "ایشیائی تحفظ کے نظام" یا جنوبی ایشیا کے لئے صدر نکسن کا تجویز کردہ "علاقائی استحکام کا نظام" سے ملتی جلتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اکبر بگٹی کی تجویز کردہ کنفیڈریشن کا دائرہ اثر برما، سری لنکا اور نیپال تک ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی دوسری جداگانہ خصوصیت نہیں ہے۔

اکبر بگٹی کا خیال ہے کہ پاکستان، بھارت، افغانستان، بنگلہ دیش، برما، سری لنکا اور نیپال پر مشتمل کنفیڈریشن ایک دوسرے کی آزادی، خود مختاری کی ضامن ہو گی اور ان ممالک کے معاشی مسائل کا ایک موثر حل ثابت ہو گی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ کوئی ذی ہوش شخص بھارت کے ساتھ مسلسل محاذ آرائی کی تائید نہیں کر سکتا۔ لیکن اس جگہ اکبر بگٹی نے یہ بات فراموش کر دی کہ پاکستان اور پاکستانی عوام نے کبھی بھارت کے خلاف محاذ آرائی کی پہل نہیں کی۔ البتہ جب ان پر جنگ ٹھونپ دی گئی تو اپنی آزادی اور خود مختاری کو برقرار رکھنے کے لئے انہیں جنگ کے میدان میں اترنا پڑا۔ اکبر بگٹی گزشتہ ۲۵ سال کی تاریخ سے ایسا ایک واقعہ بھی پیش نہیں کر سکتے کہ پاکستان نے بھارت سے محاذ آرائی میں پہل کی ہو۔

رہا یہ خیال کہ کنفیڈریشن کے قیام سے ایک دوسرے کی آزادی اور خود مختاری کا احترام پیدا ہو گا۔ یہ ناممکن ہے۔ اور ایسا سوچنا حماقت کی دلیل ہے۔ جب بھارت کے توسیع پسند حکمران پنچ شیلا کے اصولوں اور اقوام متحدہ کے منشور سے روگردانی کر کے جوناگڑھ، حیدر آباد، نیپال، گوا، پاکستان کے خلاف کھلی اور اعلانیہ مسلح جارحیت کر سکتے ہیں تو کنفیڈریشن کے ڈھیلے ڈھالے ضابطہ اور قواعد اسے کیسے پابند کر سکتے ہیں۔ اکبر بگٹی کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کاغذی ضابطہ آزادی اور خود مختاری کے ضامن نہیں ہوتے۔ صرف عوامی طاقت کے ذریعے ہی آزادی اور خود مختاری کا تحفظ کیا جا سکتا ہے۔

اکبر بگٹی نے "مساویانہ بنیادوں" کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ کنفیڈریشن میں شامل تمام ممالک کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ ان کا یہ خیال حقائق پر مبنی نہیں۔ بھارت ایک بڑا ملک ہے۔ صنعتی اور فوجی اعتبار سے جنوبی ایشیا کا طاقتور ملک ہے۔ اس کے علاوہ اس کے عزائم توسیع پسندانہ ہیں۔ اس لئے کنفیڈریشن میں بھارت کی بالادستی ہو گی۔ کیا اکبر بگٹی کی یہ خواہش ہے کہ پاکستان، افغانستان، برما، سری لنکا، نیپال، اور ایران پر بھارت کی بالادستی قائم ہو جائے۔ ان علاقوں پر ترنگا لہرائے۔ اور ان ممالک پر اشوک چکر کا سایہ پھیل جائے۔

پاکستان کے عوام کسی بھی کنفیڈریشن کے مخالف ہیں۔ وہ آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ اور اپنے ملک کی آزادی، سلامتی اور قومی خود مختاری کے لئے بڑی سے بڑی قربانیاں دینے کیلئے تیار ہیں۔

ایرانی اخبارات قیوم خاں کے ترجمان بن گئے

ان دنوں ایرانی اخبارات نیپ اور اسکے رہنماؤں کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ کر رہے ہیں۔ ولی خان اور بزنجو کے خلاف خبروں اور اداریوں کی توپیں داغ رہے ہیں۔ دونوں کو "غدار" اور "ملک دشمن" قرار دے رہے ہیں۔ سیاسی اداکار کے نام سے نواز رہے ہیں۔ ایرانی اخبارات کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایرانی اخبارات نہیں بلکہ قیوم لیگ کے ترجمان ہیں۔ کیہان انٹرنیشنل نے ۳۰ مئی کو ولی خان اور بزنجو کے خلاف ایک اداریہ لکھا، جس میں کہا گیا کہ ولی خان اور بزنجو "لندن پلان" کے سرگرم رکن تھے اور نیپ پر الزام لگایا گیا کہ وہ پاکستان کو تقسیم کرنا چاہتی ہے، جسے پاکستان پیپلز پارٹی کے ترجمان روزنامہ "مساوات" لاہور نے اپنی ۳۱ مئی کی اشاعت میں شائع کیا۔ "مساوات" کے مطابق کیہان انٹرنیشنل نے اپنے اداریہ میں لکھا۔

" قبائلی کھڑپینچ خان عبدالولی خاں اور سردار غوث بخش بزنجو اپنے آپ کو باصلاحیت سیاسی اداکار کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں۔ دونوں بہتان تراش محب وطن کا کردار ادا کرنا چاہتے ہیں۔ دونوں نے نہایت فن کاری سے شہنشاہ ایران پر پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا الزام عائد کیا ہے۔ مداخلت کا یہ الزام شہنشاہ ایران کے اس دعوے پر عائد کیا ہے کہ "ایران پاکستان کے مزید ٹکڑے کرنے کا مخالف ہے" حالانکہ ان دونوں قبائلی آقاؤں کی شہرت پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ان کے حقیقی مقاصد سمجھ میں آجاتے ہیں کہ یہ دونوں شخص "لندن پلان" کے سرگرم رکن تھے، جسکا مذموم مقصد پاکستان کو تقسیم کرنا تھا۔"

" زیادہ تر پاکستانی جانتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا پاکستانی حب الوطنی کے ان علمبرداروں کو کوئی دکھ نہیں پہنچا۔ علاوہ ازیں اپنے آپ کو پاکستان کے جاگیردار بنانے کے لئے ان دونوں شریف آدمیوں پر بیرونی طاقتوں سے حمایت حاصل کرنے کا الزام بھی عائد ہو چکا ہے۔ ان کی پارٹی کے اراکین پاکستان کی سلامتی کو نقصان پہنچانے کے لئے بیرونی طاقتوں کے ایجنٹوں کی حیثیت سے کام کرنے کے الزام میں گرفتار ہو چکے ہیں۔"

"ایران فیصلہ کر چکا ہے کہ وہ پاکستان کے اتحاد اور ملکی سلامتی کو نقصان پہنچانے کی کوششوں کے خلاف پاکستان کا ساتھ دیگا۔ اگر خان اور سردار اس امر سے ناخوش ہیں تو وہ سینہ کوبی کر سکتے ہیں۔ کوئی محب وطن پاکستانی ان کے لئے افسوس نہیں کرے گا۔"

الفتح کے نظریات محنت کشوں کے ہتھیار بن گئے ہیں!

ڈبلیو-پی-آئی-ڈی-سی-ایمپلائز فیڈریشن پنجاب کے صدر خان محمد نثار عوامی ثقافتی محاذ پنجاب کے آرگنائزنگ سیکرٹری اجمل نگری لیبر یونین کھاد فیکٹری ملتان کے جنرل سیکرٹری فقیر حسین اظہر۔ لیبر یونین آرٹسکیس ریلبو کے صدر بشیر احمد اور جنرل سیکرٹری حافظ محمد حسین پاک چین لیبر فرینڈ شپ ایسوسی ایشن ملتان کے جنرل سیکرٹری ریاض شاہد، لیبر یونین سعید انجینئرنگ کے نائب صدر عبدالمالک۔ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن ملتان کے صدر ڈاکٹر میاں عبدالرشید این-ایس-ایف کے رہنما عزیز نیازی۔ ناصر عباس زیدی۔ گورنمنٹ کالج پولٹیکل سائنس سوسائٹی پوسٹ گریجویٹ ملتان کے جنرل سیکرٹری عبدالسلام نے مشترکہ بیان میں حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ فی الفور محنت کشوں کے ترجمان جریدے "الفتح" کے لئے کاغذ کا کوٹہ بحال کیا جائے۔ ان رہنماؤں نے کہا ہے کہ الفتح محنت کشوں کا ترجمان ہے۔ اور یہ الفتح ہی ہے جس نے نظریاتی محاذ پر ملک اور محنت کش عوام کے نظریات کا ممکن حد تک پر جار کیا۔ اور رجعت پسند نظریات کا پوسٹ مارٹم کیا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ نیز یہ الفتح ہی ہے جو حکمران طبقات کی کھوکھلی نعرہ بازی، عوام دشمنی اور ملک دشمنی کا پردہ چاک کر رہا ہے۔

انہوں نے کہا کہ موجودہ حکمران اگر الفتح کو بند کرنے پر تل گئے ہیں تو انہیں علم ہونا چاہیئے کہ الفتح ایک جریدہ نہیں بلکہ تحریک ہے۔ اگر حکمران الفتح کو ۳۶ صفحات کو صرف حروف سمجھتے ہیں تو یہ ان کی بھول ہے۔ چونکہ وہ نظریات جو الفتح کے ذریعے محنت کشوں تک پہنچتے ہیں وہ محنت کشوں کے ہتھیار بن گئے ہیں، جو محنت کشوں سے چھینے نہیں جا سکتے۔

بیان میں صدر پاکستان سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ وزارت اطلاعات کو فی الفور تنبیہہ کریں کہ محنت کشوں کے ترجمان الفتح کیخلاف انتقامی کاروائیاں بند کرے۔ ملتان کے رہنماؤں نے الفتح کے صحافی ساتھیوں کو اپنے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ اور قارئین الفتح سے اپیل کی کہ وہ اپنے جریدہ کا ہر ممکن تحفظ کریں۔

آل بنک ایمپلائز فیڈریشن حیدرآباد کے سیکرٹری جنرل

حبیب الدین جنیدی اور سیکرٹری تعلقات عامہ منصور احمد نے ایک مشترکہ اخباری بیان میں ہفت روزہ الفتح کے نیوز پرنٹ کا کوٹہ بند کرنے کی شدید مذمت کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس کارروائی سے حکومت کے اس دعویٰ کی قلعی کھل جاتی ہے کہ وہ ملک میں آزادی افکار اور آزادیٔ صحافت کی علمبردار ہے۔ بیان میں کہا گیا ہے کہ اس قسم کی غیر جمہوری کارروائیوں کے ذریعے الفتح کو حق بات کہنے سے باز نہیں رکھا جا سکتا۔ بیان میں الفتح کے نیوز پرنٹ کا کوٹہ بحال کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

ٹیلی کمیونیکیشن منسٹریل اسٹاف ویلفیئر یونین کراچی کے جنرل سیکرٹری عرفان خان چمن نے اپنے ایک بیان میں مظلوم عوام کے ترجمان ہفت روزہ الفتح کے نیوز پرنٹ کا کوٹہ منسوخ کرنے پر اظہار افسوس کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ الفتح پاکستان کے باشعور عوام کا واحد اخبار ہے جس نے یحیٰی کے دور آمریت میں حق کی آواز بلند کر کے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا تھا۔

سرخرو جھوٹ ہے

مسلم شمیم

قتلِ گل، قتلِ صبا، قتلِ سحر کی تقریب
منعقد ہوتی رہی بارہا ایوانوں میں
قلعۂ جبر و تشدد میں
قصرِ ظلمت میں
خلوتِ شب میں
گاہے گاہے سرِ راہے
اور اس بار یہ تقریب بڑی شان کے ساتھ
منعقد اہلِ ہوس کے ہاتھوں
رہگذاروں پہ ہوئی
شاہراہوں پہ ہوئی
برسرِ بازار ہوئی
دشت و صحراؤں میں ہوئی
کوہساروں میں ہوئی
کوچۂ شہرِ نگاراں میں ہوئی
نامِ گل، نامِ صبا، نامِ سحر وردِ زبان
ہر نفس گام بہ گام
محترم ہے روشِ مکر و فریبِ شب خوں
معتبر جہل و تعصب کی فسوں کاری ہے

ظلم خنداں ہے
شیوۂ راہزنی کی خیر
پیشۂ قتل کی عظمت کی دہائی دیجیے
راہزن کو خضرِ وقت کے القاب ملے
دستِ قاتل کے تقدس کی قسم کھائی گئی
کتنے گیین
کتنے تھیو، کتنے چیانگ
کتنے ہٹلر
شاملِ قافلہ دردِ رہے ہیں اکثر
دوستو کوئی نئی بات، نہیں ریت نہیں
ساتھیو چلتے رہو
ہم روایاتِ شکاگو کے امین
خونِ فیر چیک کے تقدس کے امین
عظمتِ خونِ لومبا کے امین
خونِ ناصر کی رفعتوں کے امین
نذرِ خوں دیتے رہے ہیں
سرِ محفل، سرِ زنداں، سرِ مقتل، سرِ دار
نذرِ خون دیتے رہیں گے ہم لوگ

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

۲۱-۲۸ جون ۱۹۷۳ء





قرضوں کو متوازن رکھنے کے لئے باقاعدہ ڈھانچہ تشکیل دیا گیا

بینک اصلاحات کو مثبت کوشش قرار دیا جاسکتا ہے

الفتح رپورٹ

مارچ ۱۹۷۳ء تک پاکستان میں بنکوں کی تعداد ۲۳ تھی۔ ان کی شاخوں کی مجموعی تعداد ۲۹۴۲ تھی۔ ان تمام بنکوں میں ڈپازٹ شدہ رقوم کی مالیت ۱۵ ارب ۸۰ کروڑ ۴ لاکھ روپے تھی۔ اس ڈپازٹ کے تناسب سے مختلف صنعتی اور تجارتی اداروں کو ان بنکوں کی طرف سے جو قرضے جاری کئے گئے تھے۔ اس کی مالیت ۱۱ ارب ۹۳ کروڑ ۸۸ لاکھ روپے تھی۔ بظاہر تو قرضوں کی یہ مالیت ہر طرح اطمینان بخش ہے، لیکن بنکوں پر ایک الزام یہ تھا کہ بنکوں سے جاری ہونے والے قرضے ہر طبقے کو مساوی یا یکساں حقوق کی بنیاد پر نہیں ملے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ بنک صرف انہی تاجروں اور صنعت کاروں کو قرضے دیتے تھے، جن سے قرضوں کی واپسی کے سلسلے میں مناسب ضمانت مل جاتی۔ بنکوں کی رقوم کے تحفظ کے سلسلے میں یہ طریقہ کار گو انتہائی مناسب تھا، لیکن اس طرح ہوتا یہ تھا کہ صرف وہ بڑے صنعت کار یا تاجر قرضوں کی سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکتے تھے، جو آسانی سے مناسب ضمانت پیش کر سکتے ہوں۔ چھوٹے صنعت کاروں اور تاجروں کو یا ان افراد کو جو ضمانت پیش نہیں کر سکتے تھے، قرضوں کی سہولت سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تھا۔ چھوٹے صنعت کاروں کو قرضے نہ ملنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ پچھلی حکومتوں نے جو ترقیاتی منصوبہ بندی کی تھی، اس میں بھی صرف بڑے صنعت کاروں اور تاجروں کو فائدہ پہنچتا تھا۔ اس منصوبہ بندی کے تحت صرف بڑے اداروں کے قیام کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ اس صورتِ حال کے تدارک کے لئے نیشنل بنک آف پاکستان میں ۱۹۶۴ء میں پیپلز کریڈٹ ڈیپارٹمنٹ قائم کیا گیا۔ پھر جنوری ۷۰ء میں ایکوٹی پارٹیسپیشن فنڈ قائم ہوا۔ مئی ۷۰ء میں چھوٹے قرضوں کی اسکیم نافذ ہوئی لیکن ان سب کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا۔

موجودہ حکومت نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ چھوٹا قرضہ لینے والوں کے لئے زیادہ رقوم فراہم کی جائیں۔ موجودہ حکومت کی یہ کوشش ایک فلاحی معاشرہ قائم کرنے کے سلسلے میں مثبت اقدام کی حیثیت رکھتی ہے۔ فلاحی معاشرے کے قیام اور چھوٹے قرضہ لینے والوں کے لئے زیادہ رقوم کا بندوبست کرنے کے لئے مئی ۱۹۷۲ء میں بنکاری نظام کی اصلاح کی گئی۔ اسٹیٹ بنک کو پہلے کی نسبت زیادہ اختیارات دیئے گئے تاکہ وہ اپنے منصوبوں پر زیادہ موثر عملدرآمد کرا سکے۔ اس نظام کے تحت اسٹیٹ بنک کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ بنکوں کی انتظامیہ کی بدعنوانیوں کو روکنے کے لئے براہِ راست مداخلت کر سکے۔

بنک اصلاحات کا مقصد یہ بھی تھا کہ بنکاری کے نظام کو اس طرح مدون کیا جائے کہ تجارتی بنکوں کی کارکردگی کو وسیع تر سماجی نظام سے ہم آہنگ کیا جاسکے۔ اس ضمن میں زیادہ واضح طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اصلاحات کے تین بنیادی مقاصد تھے۔

- بنکوں کی کارکردگی اور استحکام میں اضافہ کرنا۔
- بنکوں کے قرضوں کی زیادہ مساوی اور بامقصد بنیاد پر اجرائی۔
- بنک کاری کے نظام میں زیادہ بڑے پیمانے پر سماجی تحفظ کا یقین حاصل کرنا۔

ان تین بنیادی مقاصد کی تکمیل کے لئے اسٹیٹ بنک کو وسیع ترین اختیارات دیئے گئے۔ علاوہ ازیں کچھ پابندیاں بھی لگائی گئیں۔ مثلاً بنکوں کے ڈائریکٹروں کو دیئے جانے والے قرضوں پر ایک حد مقرر کر دی گئی۔ یہ حد ڈائریکٹروں کے اہلِ خاندان اور ان کے زیرِ کفالت افراد کے لئے بھی عاید تھی۔ نیز ان کے لئے غیر محفوظ قرضوں کی اجرائی کی اجازت بھی نہیں رہی۔ بنکوں کے دیگر ملازمین اور منتظمین کے قرضوں پر بھی سخت پابندیاں اور حدیں مقرر کر دی گئیں۔ بنکوں کو ڈائریکٹروں کے حصص وغیرہ کے بدلے میں قرضے جاری کرنے اور حصص کی خرید و فروخت کے سلسلے میں کسی قسم کی ذمہ داری قبول کرنے سے بھی روک دیا گیا۔ اسٹیٹ بنک کو ______ کسی قسم کی بھی نجی بنک کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں کسی ڈائریکٹر کو نامزد کرنے، کسی بھی ڈائریکٹر یا افسر کو سبکدوش یا معطل کرنے اور اس معطلی کے دوران ایڈمنسٹریٹر مقرر کرنے کا اختیار دیا گیا۔ بنکوں کے استحکام کی خاطر قانون میں ادا شدہ سرمایہ اور محفوظ سرمایہ بڑھانے کی گنجائش رکھی گئی۔

بنکوں کے قرضوں کو متوازن رکھنے کے لئے ایک باقاعدہ ڈھانچہ تشکیل دیا گیا ہے۔ اسٹیٹ بنک کی نگرانی میں قرضوں کی قومی مشاورتی کونسل قائم کی گئی ہے۔ اس کونسل میں نجی شعبے اور حکومت کے نمائندے شامل ہیں تاکہ قرضوں کی اجرائی کے

(باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ فرمائیں)

ابوالمظاہر

بنکاری کی ترقی کے لئے نجی شعبے نے قابلِ فخر خدمات انجام دی ہیں

بینک اقتصادی ترقی کے لئے قلعے کی حیثیت رکھتے ہیں

کسی بھی ملک کی اقتصادی ترقی کے لئے سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ وسائل کو مجتمع کیا جائے اور پھر انہیں مناسب طور پر استعمال کیا جاسکے۔ اقتصادی ترقی کے لئے اس اہم خدمت کی ذمہ داری بنکاری کے شعبے پر عاید ہوتی ہے۔ اس بنیاد پر بنکاری کے شعبے کو اقتصادی ترقی کے سلسلے میں اہم ترین قلعے کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

بنکوں کے فرائض یا فوائد کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بینک صرف اقتصادی، صنعتی اور تجارتی شعبوں کی روزمرہ ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں بنکوں کے فرائض یا فوائد محدود نہیں رہے۔ آج بنک نہ صرف وقتی ضروریات اور عارضی یا مختصر وقفے کے لئے پیدا ہونے والی سرمائے کی قلت رفع کرنے کا ذریعہ ہیں بلکہ طویل میعاد کے لئے بھی سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح کسی بھی ادارے کے لئے فوری طور پر وسائل کا حصول ممکن ہو جاتا ہے۔ یوں یہ کہا جاسکتا ہے کہ بنک اقتصادی سرگرمیوں کیلئے خون مہیا کرتے ہیں۔

ہمارے ملک میں بنکاری کے شعبے نے مختصر ترین مدت میں قابلِ ذکر ترقی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے وقت بنکاری کے شعبے میں مسلمانوں کا حصہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ لیکن تقسیم کے فوری بعد ہمارے یہاں کے بنکاروں نے جس تندہی اور جانفشانی کا مظاہرہ کیا، اس کے نتیجہ میں آج پاکستان کا بنکاری کا شعبہ دنیا کے دوسرے ممالک سے قابلِ فخر طور پر مقابلہ کرسکتا ہے۔ پاکستان میں اس شعبے نے جو ترقی کی ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ بات ببانگِ دہل کہی جاسکتی ہے کہ غیر مسلموں کی طرف سے مسلمانوں پر مالیاتی انتظام کے سلسلے میں نااہل ہونے کا جو الزام عائد کیا جاتا تھا وہ قطعی طور پر بے بنیاد ہے۔ اس ضمن میں نجی شعبے کی کاوشوں کو خراجِ تحسین پیش نہ کرنا بھی زیادتی ہوگی۔ سچ تو یہ ہے کہ آج ہمارے ملک میں بنکاری کی جو پرشکوہ عمارت نظر آتی ہے وہ نجی شعبے کی مخلصانہ اور انتھک جدوجہد ہی کا نتیجہ ہے۔ اس شعبے نے قومی اقتصادی ترقی کے لئے جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مجموعی قومی پیداوار میں بنکوں کے ڈپازٹ کا حصہ ۹ء۴۴ فیصد سے بڑھ کر ۱۹۷۱ء میں ۵ء۴۴ فیصد تک پہنچ چکا تھا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ۵۰-۱۹۴۹ء میں مجموعی قومی پیداوار میں بیمے اور بنک کاری کا حصہ ۷ کروڑ ۰ ۷ لاکھ روپے تھا دسمبر ۷۱-۱۹۷۰ء میں یہ حصہ ۸۳ کروڑ ۳۰ لاکھ روپے ہوگیا۔ اس طرح ملک کے مجموعی مالی اثاثوں میں بنکوں کی رقوم مذکورہ مدت کے دوران ۳۶ء۷ فیصد سے بڑھ کر ۶۷ء۳ فیصد ہوگئی۔ بنکوں کے قرضوں کی حد جولائی ۱۹۴۸ء میں ۲۰ کروڑ روپے تھی۔ مارچ ۷۳ء میں یہ رقم ۱۵ ارب ۲۱ کروڑ ۳۱ لاکھ روپے ہوگئی۔ (اس میں زرعی ترقیاتی بنک کے غیر ملکی کرنسی کے قرضے اور صنعتی ترقیاتی بنک کے غیر ملکی کرنسی کے قرضے شامل نہیں ہیں) مارچ ۷۳ء میں ملک کے مجموعی مالی اثاثوں کی حد کا تخمینہ ۳۰ ارب ۴۳ کروڑ ۹۰ لاکھ روپے تھا۔ اس میں زیرِ گردش کرنسی کی حد ۹ ارب ۴۳ کروڑ ۵۷ لاکھ روپے تھی۔ شیڈول بنکوں کے عند الطلب قرضوں کی حد ۱۰ ارب ۵۴ کروڑ ۷۴ لاکھ روپے، معیادی قرضوں کی حد ۸ ارب ۲۷ کروڑ ۳۵ لاکھ روپے اسٹیٹ بنک میں دیگر ڈپازٹ کی حد ۳۵ کروڑ ۸۵ لاکھ روپے نان شیڈول بنک اور کوآپریٹو بنکوں کے ڈپازٹ کی حد ۲۶ کروڑ ۵۷ لاکھ روپے اور پوسٹ آفس سیونگ بنک کے ڈپازٹ کی حد ایک ارب 19 کروڑ ۵۵ لاکھ روپے تھی۔

بنکوں کے قرضے

مالی استحکام اور منفعت بخش ترقی کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ بنکوں میں ڈپازٹ اور قرضوں کے درمیان ایک حقیقت پسندانہ توازن و تناسب قائم رہے۔ اگر قرضوں اور ڈپازٹ کے درمیان تناسب قائم نہیں رہتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ منافع کا حصول

دشوار تر بن جائیگا۔ جہاں تک ہمارے ملک کا تعلق ہے تو یہ بات سب کے علم میں ہے کہ ہمارے یہاں بنکاری کے زیادہ تر ادارے نجی شعبے کی ملکیت ہیں۔ ان اداروں میں یہ بات باعثِ اطمینان رہی ہے کہ یہاں ترقی پسندانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ بنکاری کے اداروں نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ ملکی حالات کے مطابق عمل کریں ـــــ بظاہر بنکوں کا عام طریقہ یہ ہوتا ہے کہ کسی بھی ادارے کو اس وقت تعاون حاصل ہوتا ہے جب وہ خود مالی طور پر مستحکم ہو۔ مالی طور پر غیر مستحکم یا پریشانیوں میں مبتلا ادارے کسی اہم تعاون سے محروم رہتے ہیں۔ یوں کہئے کہ بنکوں کی حیثیت بالعموم ایسے افراد کی ہوتی ہے جو دھوپ کی تمازت سے بچانے کے لئے تو آپ کو اپنی چھتری فراہم کر سکتا ہے۔ لیکن بارش کے موسم میں وہ آپ چھتری دینے سے محض اس لئے انکار کر دیتا ہے کہ کہیں اس کی چھتری بارش میں بھیگ کر خراب نہ ہو جائے۔ لیکن ہمارے ہاں ۷۲-۱۹۷۱ء کے دوران بنکوں کے قرضوں کی حد میں جس طرح اضافہ ہوا ہے اسے دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے بنک درحقیقت اپنے ہم وطنوں اور اپنے ہم قوموں کے دوست ہیں۔ ۷۲-۱۹۷۱ء کے دوران پاکستان میں تجارتی سرگرمیاں گو محدود ہو چکی تھیں مشرقی پاکستان کے عظیم المیے کے بعد گو ہر شعبے میں غیر یقینی صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی صنعتوں میں تعطل سا تھا۔ لیکن اس مدت میں پاکستانی بنکوں کے قرضوں کی حد ۶۷ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۹ ارب ۲ کروڑ ۲۸ لاکھ روپے تک پہنچ گئی۔ اس طرح یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ پاکستانی بنکاروں نے ڈپازٹ اور قرضوں کے درمیان ایک حقیقت پسندانہ توازن قائم رکھنے کی کوشش بھی کی اور اپنے ہم وطنوں کو مناسب سہولتیں بھی فراہم کیں۔ حکومتِ پاکستان کی طرف سے بنکوں کے قرضوں کے متعلق جو اعداد و شمار جاری کئے گئے ہیں ان کے مطابق دسمبر ۱۹۵۵ء میں بنکوں کے مجموعی قرضے ۸۸ کروڑ ۴۱ لاکھ روپے تھے۔ ان میں سے نجی شعبے کو ۶۸ کروڑ ۷۴ لاکھ روپے دیئے گئے تھے۔ اور سرکاری شعبے کو ۱۴ کروڑ ۶۰ لاکھ روپے انٹر بنک ایڈوانسز کی حد ۵ کروڑ ۴۳ لاکھ روپے تھی۔ دسمبر ۱۹۷۲ء میں بنکوں کے قرضوں کی مجموعی رقم ۱۴ ارب ۱۶ کروڑ ۵۳ لاکھ روپے تھی۔ اس میں سے نجی شعبے کو ۱۲ ارب ۹۵ کروڑ ۱۲ لاکھ روپے سرکاری شعبے کو ۹۸ کروڑ ۷۵ لاکھ روپے اور انٹر بنک ایڈوانسز کی حد میں ۶۷ کروڑ ۷۵ لاکھ روپے دیئے گئے تھے۔ مارچ ۱۹۷۳ء میں یہ رقوم علی الترتیب ۱۵ ارب ۱۲ کروڑ ۱۳ لاکھ روپے۔ ۱۳ ارب ۸۴ کروڑ ۰۴ لاکھ روپے، ایک ارب ۳ کروڑ ۶۳ لاکھ روپے اور ۹۷ کروڑ ۸۳ لاکھ روپے ہو گئی۔ ان میں زرعی ترقیاتی بنک اور صنعتی ترقیاتی بنک کے غیر ملکی کرنسی کے قرضے شامل نہیں۔ پاکستانی شیڈول بنکوں نے صرف ۷۲-۱۹۷۱ء کے دوران صرف مغربی پاکستان میں ۲۸۵ نئی شاخیں قائم کیں۔ اس سے پچھلے سال یعنی ۷۱-۱۹۷۰ء میں ۱۸۸ نئی شاخیں قائم کی گئی تھیں۔ ۱۹۷۲ء کے اختتام پر پاکستانی بنکوں کے صدر دفاتر اور شاخوں وغیرہ کی تعداد ۲۲۲۵ تھی۔ غیر ممالک میں مزید ۹ شاخیں قائم کی گئی تھیں۔

ہماری صنعتی اور معاشی ترقی بینکوں کی مرہونِ منت ہے

اقتصادیات

بینک کاری کا ایک جائزہ

:- محمد آصف :-

موجودہ ترقی یافتہ زمانہ دراصل صنعتی ترقی کا مرہونِ منت ہے اور صنعتی دور میں معاشرے کے استحکام اور ایک ترقی یافتہ معیشت کے لئے سب سے بنیادی ضرورت سرمایہ کاری کا موثر اور ایسا جامع نظام قائم کرنا ہے جو کسی ملک کے زیادہ سے زیادہ وسائل کو بروئے کار لا کر اس کو ہر طبقے کے لئے سود مند بنا سکے۔ نظام بنک کاری دراصل اسی صنعتی اور معیشتی ضرورت کا نام ہے۔

تمام ترقی یافتہ ممالک میں نظامِ بینک کاری کو ایک سائنس کا درجہ حاصل ہو گیا ہے جس کی کارکردگی، منصوبہ بندی اور سرمایہ کاری پر دنیا کے تمام صنعتی ممالک کی ترقی کی رفتار کا دار و مدار ہے۔ اور اس کے ذریعہ ان ممالک کی اقتصادی اور معیشتی قوت اور پھیلاؤ کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔ نظامِ بنکاری کا یہ عمل ترقی پذیر ممالک کی صنعتی ترقی اور سرمایہ کاری کے وسائل کو بروئے کار لانے میں سب سے زیادہ کامیاب، مفید اور برق رفتار ثابت ہوا ہے۔ اور وہاں اس کو وہی اہمیت حاصل ہے جو انسانی جسم میں دل کو حاصل ہوتی ہے، جو خون کی قوت اور توانائی کو جسم کے ہر حصے میں پھیلاتا ہے۔ نظامِ بینکاری سے کسی ملک کے تمام وسائل اور ذرائع بروئے کار لا کر ملک کی تمام اقتصادی اور معیشتی ضرورت کو پورا کیا جاتا ہے۔ پاکستان بھی ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ جہاں کی ملی جلی معیشت میں نظامِ بینکاری کی بڑی اہمیت ہے۔ ابتدا میں پاکستان میں یہ نظام اپنی ابتدائی شکل میں تھا۔ مگر آہستہ آہستہ اس نے پاکستان کی اقتصادی اور معیشتی زندگی میں بنیادی اہمیت حاصل کر لی۔ اس وقت پاکستان کی تمام صنعتی اور معیشتی زندگی بنکنگ کی اسی منصوبہ بندی اور کارکردگی کے کنٹرول میں ہے جو ترقی پذیر ممالک کی ایک نئی سوہبیت سمجھی جاتی ہے۔

نظامِ بینکاری اگر موثر ہو اور اس کو باصلاحیت اور اہلیت رکھنے والے افراد میسر ہوں تو پھر وہ بنک جو قومی سرمایہ کو روبہ کار لاتا ہے، پورے اقتصادی وسائل کو کام میں لا کر ملک کی صنعتی اور معیشتی ترقی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ نیشنل بینک آف پاکستان کو یہی امتیاز حاصل ہے اور اس نے ایک مختصر سی مدت میں اپنی کارکردگی سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ پاکستان کی ترقی میں ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے، اور روز بروز اس کی اہمیت، وسعت اور افادیت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ تجارتی سالِ گزشتہ میں نیشنل بنک نے نظامِ بینکاری کے ہر شعبہ میں شاندار ترقی کی ہے۔ اس کا اندازہ ان مطبوعہ اعداد و شمار کے موازنے سے کیا جا سکتا ہے۔ جس کا ایک مختصر گوشوارہ درجِ ذیل ہے۔

سنہ ۱۹۷۱ء

۱۔ ڈپازٹ	۳۷٫۵ کروڑ روپے
۲۔ ایڈوانسز	۲۱۲ 〃 〃
۳۔ منافع	۲ 〃 〃
۴۔ محفوظ سرمایہ	۵٫۰۶ کروڑ روپے
۵۔ وسائل	۵۵٫۷ کروڑ روپے
۶۔ منافع حصص	۲٪

سنہ ۱۹۷۲ء

سنہ ۱۹۷۲ء	اضافہ کا تناسب
۵۶٫۵ کروڑ روپے	۵۵٫۶۶٪
۳۲۴ 〃 〃	۵۲٫۸۳٪
۵٫۹۲ 〃 〃	۱۹۶٪
۷ کروڑ روپے	۲۵٪
۸۸۰ کروڑ روپے	۵۸٪
۱۵٪	۲۰٪

ڈپازٹ:۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۷۲ء کو ختم ہونے والے سال میں نیشنل بنک کے ڈپازٹ ۵۶٫۵ کروڑ روپے تک پہنچ گئے۔ اگر اس کا موازنہ ۳۱ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ختم ہونے والے سال کے ڈپازٹ ۳۷٫۵ کروڑ روپے سے کیا جائے تو ۱۹۰ کروڑ روپے کا اضافہ نیشنل بنک کی تاریخ کا سب سے بڑا ریکارڈ ہے۔ اب تک ڈپازٹ میں اضافہ کا سب سے بڑا ریکارڈ ۱۹۶۹ء میں قائم ہوا تھا، جو ۴۴ کروڑ تھا۔

نیشنل بنک کے ایڈوانسز ۲۱۲ کروڑ سے بڑھ کر ۳۲۴

کروڑ روپے تک جا پہنچے ہیں۔ یہ اضافہ بھی ایک مثالی اضافہ ہے کیونکہ اس سے پہلے ایڈوانس میں سب سے بڑا اضافہ ۱۹۶۹ء میں ہوا تھا، جو کہ ۶ء۴ روپے تھا۔ واضح رہے کہ بنک کے زیادہ تر وسائل عوامی قرضہ جات کے تحت استعمال کئے گئے ہیں، اور اس کے ساتھ ان صنعتوں کے لئے بالخصوص مخصوص کئے گئے ہیں جنہیں حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔

۳۱ دسمبر ۱۹۷۲ء کو یعنی مالی سال زیر نظر کے ختم ہونے تک بینک نے ۹۲ء۵ کروڑ روپے منافع کمایا۔ یہ نیشنل بنک کی تاریخ میں سب سے زیادہ منافع ہے۔ اس سے قبل سب سے زیادہ منافع ۰۳ء۳ کروڑ روپے ۱۹۶۵ء میں ہوا تھا۔ اور پچھلے سال یعنی ۱۹۷۱ء کے مالی سال میں یہ منافع دو کروڑ روپے تھا۔

نیشنل بنک کا محفوظ سرمایہ امسال ۶۰ء۵ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۷ کروڑ روپے تک جا پہنچا ہے۔ گویا امسال محفوظ سرمایہ میں ۴۰ء۱ کروڑ روپے کا اضافہ ہوا ہے جو اب تک تمام مالی سالوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے۔ اس سے قبل محفوظ سرمایہ میں ۱۹۶۶ء میں ۷۵ لاکھ روپیہ منتقل ہوا تھا۔ گزشتہ ۲۲ سال کے دوران اوسطاً ۲۵ لاکھ روپے سالانہ کے حساب سے بنک کے محفوظات میں اضافہ ہوتا رہا۔ مگر اس سال کے

(باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ فرمائیں)

بقیہ احوال واقعی

سرگرم تخریبی عناصر کا ذکر کیا ہے بہتر تھا کہ وہ اس بات کی بھی وضاحت کر دیتے کہ "تخریبی عناصر" کون سے ہیں۔ موجودہ حکومت کے طبقاتی کردار اور ماضی کے اقدامات کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ عوام کا خون چوسنے والے جاگیرداروں، وڈیروں، بڑے زمینداروں اور گماشتہ سرمایہ داروں کو تخریبی عناصر نہیں سمجھتی، بلکہ اس کے نزدیک وہ مظلوم عوام تخریب پسند ہیں، جن کو محنت مشقت کرنے کے باوجود دو وقت کی رُوکھی سُوکھی روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ اگر سرمایہ دار اور وڈیرہ ایک رات میں چور بازاری اور اسمگلنگ کر کے لاکھوں روپے حاصل کر لے تو حکومت اسے منافع قرار دیتی ہے۔ اور اگر کوئی مزدور اپنی جائز اور قانونی اُجرت کا مطالبہ کرے تو اسے کمیونسٹ اور تخریب پسند کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وزیر خارجہ نے جن تخریبی عناصر کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے مُراد پاکستان کے محنت کش اور مظلوم عوام ہی ہیں۔ اگر برطانوی نوآبادکاروں کے تربیت یافتہ عزیز احمد یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سنٹو کے رُکن ممالک کی مدد اور تعاون سے مظلوم عوام کی جدوجہد اور تحریک کو کچل دیں گے، تو یہ اُن کی خام خیالی ہے۔ یہ ۱۹۵۵ء نہیں ۱۹۷۳ء ہے۔ عوام کا شعور بہت بلند ہو چکا ہے۔ اب انہیں خوبصورت اور بھڑک دار پروپیگنڈے سے متاثر نہیں کیا جا سکتا۔

حکومت کو چاہیئے کہ وہ حقائق کو تسلیم کرے، شتر مُرغ کی طرح اپنا سَر ریت میں نہ چھپائے۔ انکل سام اور جان بل کی بجائے عوام پر اعتماد کرے، سنٹو کو خدا حافظ کہہ دے جیسا کہ اس نے عوام سے وعدہ کیا تھا۔

بقیہ بینکاری کا ایک جائزہ

شاندار اضافے سے سرمایہ محفوظ کرانے والوں کو یقیناً بڑی طمانیت ہوئی ہوگی۔ اور اس کے ساتھ بنک کے حصہ داروں کے اعتماد کی بھی بڑی گنجائش پیدا ہوئی ہے کیونکہ اب ان کا منافع گزشتہ سال کے ۱۲٪ سے بڑھ کر ۱۵٪ تک پہنچ گیا ہے۔

۱۹۷۱ء میں جملہ وسائل ۷۵۵ کروڑ روپے پر مشتمل تھے۔ اس کے مقابلے [illegible] یہ وسائل بڑھ کر ۸۸۰ کروڑ روپے تک پہنچ گئے، جس سے بنک کی کارکردگی میں ۵۸٪ کا اضافہ ہوا ہے۔

نیشنل بنک نے امسال حکومت کی پالیسی کے عین مطابق بنک کے کارکنوں کو منافع میں زیادہ سے زیادہ شرکت کا موقع دیا۔ امسال اسٹاف کے لئے ۸۷ لاکھ روپے مخصوص کئے گئے۔ جب کہ ۱۹۷۱ء میں بونس کی یہ رقم ۵۵ لاکھ روپے تھی۔ اس لحاظ سے گزشتہ تمام سالوں کے مقابلہ پر اس سال بنک کے ملازمین کو سب سے زیادہ بونس کا مستحق سمجھا گیا۔

پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔ اور اس کی ۸۰ فیصد آبادی دیہات میں زندگی بسر کرتی ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ نیشنل بنک اپنے ملک کی اجتماعی قوت سے غافل رہتا۔ چنانچہ بنک نے چھوٹے کسانوں اور زرعی ترقیات کیلئے زرعی قرضہ کا ایک، قابلِ ذکر منصوبہ تیار کیا۔ جس کے مطابق پنجاب میں لائلپور اور ساہیوال کے اضلاع، سندھ میں حیدر آباد اور سرحد میں پشاور کے اضلاع میں اس منصوبے کے تحت قرضوں کی تقسیم کا کام شروع کیا گیا اور منصوبہ کے مطابق ۸ ایکڑ اراضی رکھنے والے کسانوں میں پیداوار، ترقیاتی کاموں اور کاروباری مقاصد کے لئے قرضے تقسیم کئے گئے۔ یہ منصوبہ نہایت کامیاب رہا۔ خریف ۱۹۷۳ء میں وصولیابی سو فیصد اور ربیع ۱۹۷۳ء میں ۹۸ فیصد رہی۔

گزشتہ سال بنک نے ۵۰. ۱ کروڑ روپیہ قومی دفاعی فنڈ میں بطور عطیہ دیا۔ جبکہ اُس سال کے منافع میں صرف ۵۰ لاکھ روپیہ اس کام کے لئے تفویض کیا گیا تھا۔ باقی ماندہ رقم میں سے ۹ لاکھ روپیہ امسال اور دس لاکھ روپے ۱۹۷۳ء میں ادا کئے جائیں گے۔

اس سال کے منافع سے جو سب سے زیادہ قابلِ ذکر کام کیا جا رہا ہے وہ جناح انسٹی ٹیوٹ آف بنکنگ ایجوکیشن اینڈ ریسرچ کے قیام کے لئے وہ ابتدائی اخراجات ہیں جن سے یہ مفید اور اہم ادارہ قومی خدمت کے لئے شاندار خدمات انجام دے سکے گا۔ ابتدائی اخراجات کے لئے یہ رقم دس لاکھ روپے مخصوص کی گئی ہے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ نیشنل بنک کے ایک نئے تعمیری منصوبے کے تحت قائم کیا گیا ہے، جو بنک کاری کی فنی تعلیم کے معاملات اور مقاصد میں قومی ضروریات کو پورا کرنے میں مفید ثابت ہوگا۔ اور اقتصادیات کے تحقیقی شعبہ میں ایک اہم کردار ادا کریگا۔

نیشنل بنک کی اس مختصر کارکردگی سے ہر شخص یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس نے قوم کے اقتصادی اور معیشتی ڈھانچہ میں کتنی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ اور پاکستان کے صحیح تر مفادات میں کیا خدمات انجام دے رہا ہے۔ دو سال کے اس تقابلی موازنے کے حقائق پر مبنی یہ اعداد و شمار ثابت کرتے ہیں کہ نیشنل بنک نے یہ خدمات اور اپنے مقاصد میں یہ شاندار کامیابی اَن تھک محنت، پُرخلوص منصوبہ بندی اور بہترین کارکردگی سے حاصل کی ہے جس کی کامیابی کا سہرا اس کے کارکنوں کی اہلیت اور صلاحیت کے سر بندھتا ہے۔

بقیہ بنک اصلاحات

سلسلے میں اس بات کا خیال رکھا جا سکے کہ قرضے طے شدہ ترجیحی پروگراموں اور سالانہ منصوبوں کی روشنی میں جاری کئے جائیں۔ اس کونسل نے دسمبر ۱۹۷۲ء میں نجی شعبے کے لئے مزید ایک ارب ۵۶ کروڑ روپوں کے بنک قرضوں کی منظوری دی۔ یہ قرضے چھوٹے قرضوں، زرعی قرضوں، چھوٹے مکانات کی تعمیر کے لئے قرضوں کی صورت میں جاری کئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ کریڈٹ گارنٹی اسکیم بھی نافذ کی گئی جس کی رو سے اسٹیٹ بنک چھوٹے قرضوں کے مسلمہ نقصانات کے ضمن میں نجی بنکوں کے نقصانات کا ۵۰ فیصد بوجھ برداشت کرے گی۔

بنک اصلاحات کے تحت اسٹیٹ بنک نے سرمایہ کاری کی چار نئی اسکیمیں بھی مرتب کی ہیں۔ ایک اسکیم نجی بنکوں کے ذریعہ زرعی قرضوں کی اجرائی کے لئے ہے۔ دوسری اسکیم مقامی طور پر مشین سازی کی صنعت کے لئے ہے۔ تیسری اسکیم چھوٹے صنعت کاروں اور تاجروں کے لئے مرتب کی گئی ہے اور چوتھی اسکیم غیر روایتی یا نئی برآمدات کی حوصلہ افزائی کے لئے بنائی گئی ہے۔ ان میں سے پہلی تین اسکیمیں اکتوبر تا دسمبر ۱۹۷۲ء کے درمیان نافذ کی گئیں اور آخری اسکیم فروری ۱۹۷۳ء میں نافذ ہوئی۔

چھوٹے قرضوں کی اسکیم کے تحت قرضوں کی جو وضاحت کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ تجارتی مقاصد کے لئے ۵۰ ہزار روپے تک جامد اثاثوں کی موجودگی میں صنعتوں کے لئے دس لاکھ روپے تک قرضے دیئے جائیں گے۔

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi

